

اورنگ آباد کی واپسی



اورنگ آباد کی واپسی

ایک پچھلی یادداشت (ڈریگولا کا خاتمہ)

مینا ہار کر کارو زنا چ

۶ نومبر۔ دوپہر ڈھل رہی تھی کہ ہم مشرق کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی طرف سے میرا جنتھن آرہا ہے۔ یوں میرا دل کتا تھا۔ ہماری رفتار تیز نہ تھی۔ حالانکہ ہم ڈھلان اتر رہے تھے۔ ہم مال و سامان سے لدے ہوئے تھے۔ کمبلوں اور اشیائے خورد و نوش کا کافی ذخیرہ ہمارے پاس تھا۔ ہم یہ سامان پھینک دیتے لیکن یہ خطہ جہاں ہم سفر کر رہے تھے۔ بالکل غیر آباد تھا۔ کوئی ایک میل چلنے کے بعد میں تھک کر بیٹھ گئی۔ ہم نے پیچھے دیکھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر نیلے آسمان کے پس منظر قعر ڈریگولا اپنی تمام تربیت ناکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور اس کے پیچھے ننگے ننگے پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ اور سامنے برف سے ڈھکا ہوا راستہ تھا جو بلندیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ ہر طرف وحشت برس رہی تھی اور کہیں دور سے بھیڑیوں کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ پروفیسر صاحب کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے سستالیں اور بھیڑیوں سے محفوظ رہیں۔

سواروں کا ایک گروہ بھاگ بھاگ چلا آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے حلقے میں ایک چمکڑا تھا۔ جو کچی سڑک پر بری طرح اچھل اور ڈول رہا تھا۔ ان لوگوں کو پہچاننے میں مجھے دیر نہ لگی۔ ان کا لباس اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ وہ خانہ بدوش ہیں۔

چمکڑے میں ایک بڑا سا چوکور تابوت رکھا ہوا تھا جسے دیکھتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انجام قریب تھا۔ شام ہو چلی تھی۔ اور میں جانتی تھی کہ سورج غروب ہوتے ہی ”وہ“ جس تابوت میں سویا ہوا ہے، تابوت سے نکل کر اور روپ بدل کر فرار ہو سکے گا۔ اس خیال نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ میں پروفیسر صاحب کی طرف پلٹی لیکن وہ وہاں نہ تھے۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ پروفیسر صاحب چٹان کے قدموں میں لکڑی کی نوک سے دائرہ کھینچنے میں مصروف تھے۔ جیسا کہ ہگزشتہ رات کھینچا تھا۔ دائرے کے محیط پر مقدس روٹی کے ٹکڑے بکھیر کر وہ میرے پاس آئے اور بولے۔

”اس دائرے میں تم کم سے کم اس عفریت سے تو محفوظ ہو۔“

انہوں نے میرے ہاتھ سے دور بین لے کر اپنی آنکھوں سے لگالی۔ چند ثانیوں کے لئے برف گرنا بند ہو گئی۔ پروفیسر صاحب نے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بہت غلت میں ہیں۔ گھوڑوں پر بے تحاشہ چابک برسا رہے ہیں۔“

اور پھر چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

”وہ لوگ سورج غروب ہونے سے پہلے منزل تک پہنچ جانا چاہتے ہیں، مینا! ہم

شاید جیتی ہوئی بازی ہارنے والے ہیں۔ خیر! جو خدا کی مرضی۔“

برف گرنے لگی اور ہم کچھ دیکھ نہ سکے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی برف گرنا پھر بند

ہو گئی۔ پروفیسر صاحب نے دور بین آنکھوں سے لگالی اور چند لمحوں بعد خوشی سے چیخ

تھوڑی دیر بعد پروفیسر صاحب نے اشارے سے مجھے بلایا۔ میں اٹھ کر ان کے پاس پہنچی۔ انہوں نے بے حد اچھی جگہ تلاش کر لی تھی۔ چٹانی سلسلے میں ایک شکاف تھا جس میں داخل ہونے کا دروازہ نیچا اور مخرابی تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اس شکاف میں لے گئے۔

”مینا! یہاں تم سردی اور برف سے محفوظ رہو گی۔“ انہوں نے کہا۔ ”اگر بھیڑیے آگئے تو ہم پر چاروں طرف سے حملہ نہ کر سکیں گے۔ اور میں شکاف کے دہانے پر کھڑا ہو کر آسانی سے ان کا مقابلہ کر سکوں گا۔“

وہ باہر جا کر کمبل اور دوسری چیزیں اٹھا لائے۔ میرے لئے بستر تیار کیا اور کھانا نکال کر مجھے مجبور کیا کہ میں تھوڑا سا کھالوں۔ لیکن میں نہ کھا سکی۔ خدا جانے کیوں کھانا دیکھتے ہی میرا جی متلانے لگا۔ کوشش کے باوجود میں ایک لقمہ بھی نہ کھا سکی۔ پروفیسر صاحب لو اس ہو گئے لیکن منہ سے کچھ نہ کہا اور نہ ہی مجھے پھر مجبور کیا۔

اپنی دور بین لے کر وہ قریب کی چٹان پر چڑھ گئے اور اسے آنکھوں سے لگا کے افق کا جائزہ لینے لگے۔

”مینا! مینا! دیکھو۔“

میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچی۔ انہوں نے دور بین مجھے دے کر ایک طرف اشارہ کیا۔ اب برف باری کچھ زیادہ ہی ہو رہی تھی۔ اور ہوا میں بھی تیزی آگئی تھی۔ کبھی کبھی ہوا برف کو اڑا لے جاتی یا پھر تھوڑی دیر کے لئے برف گرنا بند ہو جاتی تو میں دور دور تک دور بین کی مدد سے دیکھ سکتی تھی۔

ہمارے قدموں میں برف سے ڈھکا ہوا میدان حد نظر تک پھیلا ہوا تھا اور دور بہت دور ایک سیاہ لکیر اس میدان میں سے گزر رہی تھی جو غالباً دریا تھا۔ اور ہمارے سامنے اور اتنے قریب کہ مجھے حیرت ہوئی کہ ہماری نظران پر کیوں نہ پڑی۔ گھر

کر بولے۔

”ہینا! دیکھو! دیکھو! دو گھڑ سوار حیرت انگیز تیز رفتاری سے چکڑے کی طرف آرہے ہیں۔ دونوں شمال کی طرف سے آرہے ہیں اس لئے یقیناً ہمارے دوست کوئی اور جان ہیں۔ لویہ دور بین اور اس سے پہلے کہ برف دوبارہ گرنے لگے انہیں پہچاننے کی کوشش کرو۔“

میں نے دور بین لگا کے شمال کی طرف دیکھا وہ دونوں ڈاکٹر سیورڈ اور کوئی ہی تھے کیونکہ ان میں سے ایک بھی جناح کا ساندہ تھا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ جناح بھی زیادہ دور نہیں۔ میں نے جنوب کی طرف دیکھا اور میرے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ دوسرے دو گھڑ سوار خطرناک تیز رفتاری سے بھاگے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک، میں نے پہچان لیا، جناح تھا چنانچہ دوسرا آر تھا۔ وہ دونوں بھی چکڑے کی طرف ہی آرہے تھے۔ میں نے پروفیسر صاحب کو ان دونوں کی آمد کی اطلاع دی تو وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ انہوں نے مجھ سے دور بین لے لی اور ان کی طرف دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ برف کا ایک ریلا گرا اور ہماری نظروں کے سامنے سفید چادر سی تن گئی۔ پروفیسر صاحب چٹان کے شکاف میں گھس کر دو چشمہ بندوق لے آئے اور ایک پتھر کے سارے کھڑی کر کے بولے۔

”وہ لوگ بڑی تیزی سے آرہے ہیں چنانچہ ہم جلد ہی ان خانہ بدوشوں کے نرغے میں ہوں گے۔ اسی خیال سے میں بندوق نکال لایا ہوں۔“

میں نے بھی اپنا پتول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ بھیڑیوں کے چلانے کی آوازیں قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ چنانچہ چند ثانیوں کے لئے برف گرنی بند ہوئی تو ہم نے پھر آنے والوں کی طرف دیکھا۔ عجیب بات تھی کہ برف ہمارے چادوں کی طرف گر رہی تھی لیکن افق مغرب میں سورج چمک رہا تھا۔ وہ بلند پہاڑیوں کے پیچھے

چھپنے کے لئے تیزی سے ڈھل رہا تھا۔ میں نے چادوں سمٹوں کا جائزہ لیا اور ہر چار طرف سے بڑے بڑے بھیاںک سائے ہماری طرف بڑھتے نظر آئے۔ یہ بھڑپے تھے۔

ہم بے چینی سے منتظر تھے کہ کیا ہوتا ہے۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک سال ہو رہا تھا۔ یکایک ہوا تیز ہو گئی اور برف کے گالے رقص سا کرنے لگے اور چند ثانیوں بعد ہی فضا صاف تھی۔ اور اب ہم دور تک دیکھ سکتے تھے۔ پچھلے چند مہینوں سے ہم سورج کے طلوع و غروب کی طرف اتنے متوجہ ہو رہے تھے کہ اب ہم جانتے تھے کہ وہ کب طلوع اور کب غروب ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اس طلوع و غروب کی علامتیں کیا ہیں۔ ہمیں چٹان پر کھڑے ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ آنے والے بہت قریب آگئے۔ ہوا بہت زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ جیسے ہمیں چٹان پر سے گرا دینا چاہتی ہو۔ کبھی کبھی برف کا ریلا آجاتا تھا ورنہ زیادہ تر فضا صاف ہی رہتی تھی۔ اب میں آنے والوں میں سے ہر ایک کو، یعنی جن کا تعاقب کیا جا رہا تھا اور جو تعاقب کر رہے تھے، بخوبی دیکھ اور پہچان سکتی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ لوگ جن کا تعاقب کیا جا رہا تھا، کرنے والوں کی طرف متوجہ نہ ہوئے یا تو خانہ بدوشوں نے انہیں دیکھا نہ تھا یا اگر دیکھا تھا تو ان سے ڈرتے نہ تھے۔ تاہم انہوں نے اپنی رفتار دگنی کر دی۔ سورج لمحہ بہ لمحہ ڈھلتا جا رہا تھا۔ خانہ بدوش بار بار سورج کی طرف دیکھتے اور گھوڑوں پر چابک برسانے لگتے چکڑا زیادہ ڈولنے لگتا اور گھوڑے اپنی رفتار تیز کر دیتے۔

آنے والے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ میں اور پروفیسر صاحب پتھر کے پیچھے چھپ گئے۔ ہم دونوں بندوق اور پتول لئے تیار بیٹھے تھے۔ پروفیسر صاحب کے اوارے سے ظاہر تھا کہ وہ خانہ بدوشوں کو ہمیں روک لینے کا فیصلہ کئے ہوئے ہیں، خانہ بدوش اور ہمارے ساتھی بھی ہماری موجودگی سے بے خبر تھے۔

دفعاً دو آدمیوں نے ایک زبان ہو کر اور چیخ کر کہا۔
”رک جاؤ۔“

ایک آواز جاتھن کی تھی اور دوسری ڈاکٹر سیورڈ کی تھی۔ خانہ بدوش یقیناً اس زبان سے، جس میں انہیں رک جانے کا حکم دیا گیا تھا واقف نہ تھے لیکن لب و لہجہ سے ہر آدمی، خواہ وہ کتنا ہی بے وقوف کیوں نہ ہو، اندازہ لگا سکتا تھا کہ اسے کیا حکم دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ خانہ بدوشوں نے اپنے گھوڑوں کی لگائیں کھینچ لیں۔ بیک وقت ایک طرف سے کون سی اور ڈاکٹر سیورڈ اور دوسری طرف سے جاتھن اور آر تھر خانہ بدوشوں کے گردہ کی طرف بڑھے۔ خانہ بدوشوں کے سردار نے، جو ایک تھو مند گھوڑے پر قطور کی طرح سوار تھا اور نوجوان تھا خطرے کی بو پا کر اور چیخ کر کچھ کہا۔ یکایک خانہ بدوشوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی ہو ا میں چابک بلند ہوئے۔ شرک کی آواز آئی اور گھوڑے بے تحاشہ بھاگ پڑے۔ چاروں تعاقب کنندگان نے بندوقوں کی ٹالیاں خانہ بدوشوں کی طرف کدیں۔
”رک جاؤ“ انہوں نے حکم دیا۔

عین اسی وقت میں اور دان پلسنگ بھی پتھر کے پیچھے سے نکل آئے ان کی بندوق اور میرے پستول کا رخ بھی خانہ بدوشوں کی طرف تھا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ گھر گئے خانہ بدوشوں نے گھوڑے روک لئے۔ سردار نے پھر کچھ کہا اور ہر آدمی نے وہ ہتھیار ... چاقو، چھری، نیزا، پستول جو جس کے پاس تھا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ فریقین مارنے مرنے پر تل گئے خانہ بدوش چھڑے کو اپنے حلقے میں لئے تیار کھڑے تھے۔

یکایک خانہ بدوشوں کا سردار اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کے آگے بڑھا اور پہلے غروب ہوتے ہوئے سورج اور پھر قصر ڈر کیلا کی طرف اشارہ کر کے ہمارے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ جواب میں ہمارے ساتھی فوراً گھوڑوں پر سے اتر پڑے اور چھڑے کی طرف

بڑھے۔ کوئی اور وقت ہو تا تو میں خوف سے چیخ اٹھی ہوتی لیکن اس وقت ہم بھی اتنے ہی خطرے میں تھے جتنے کہ ہمارے ساتھی۔ اگر ان کے سروں پر موت منڈلا رہی تھی تو ہم بھی اس کے پھول کی پھڑ پھڑا ہٹ سن رہے تھے۔ چنانچہ دہشت زدہ ہونے کے بجائے میرا جی اپنے ساتھیوں کی مدد کرنے کو چاہا۔ ہمارے ساتھیوں کو یوں بڑھتے دیکھ کر نوجوان سردار نے پھر کچھ کہا اور خانہ بدوشوں نے چھڑے کے گرد اپنا حلقہ تنگ کر لیا۔

اور ہم نے دیکھا کہ ایک طرف سے جاتھن اور دوسری طرف سے کوئی خانہ بدوشوں کا حلقہ توڑتے ہوئے چھڑے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے اپنا کام پورا کر لینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت اب انہیں نہ روک سکتی تھی۔ کوئی چیز ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکتی تھی۔ حتیٰ کہ غروب ہوتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں چمکتے ہوئے خانہ بدوشوں کے جان لیوا چاقوؤں کی بھی انہوں نے پردانہ کی۔ اور نہ بھیڑیوں کی آواز ہی، جو دم بدم قریب ہوتی جا رہی تھی، انہیں اپنی طرف متوجہ کر سکی۔

جاتھن ایسے جوش سے برہا تھا کہ خانہ بدوش مرعوب ہو کے دائیں بائیں دب گئے اور اسے گزر جانے دیا۔ دوسرے ہی لمحے جاتھن کود کر چھڑے پر چڑھ گیا اور حیرت انگیز پھرتی سے تابوت اٹھا کے نیچے لٹکا دیا۔ خدا جانے اتنی طاقت اس میں کہاں سے آگئی تھی۔ ادھر کوئی کو چھڑے تک پہنچنے میں قوت بازو سے کام لیتا پڑا وہ خانہ بدوشوں کا حلقہ توڑتا اور انہیں دائیں بائیں دھکیلتا ہوا آگے بڑھا۔ بہت سے چاقوؤں کے پھل غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک کر کوئی کی طرف بچھکے تھوڑی دیر تک ہمیں کوئی نظر نہ آیا اور پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا خانہ بدوشوں کے گردہ میں سے نکلا اور اب وہ جاتھن کے قریب کھڑا تھا۔

تابوت میں بھی ہوئی مٹی میں مل گیا۔

میں عمر بھر اس خیال سے خوش ہوتی رہوں گی کہ اس وقت جب جناح کا چاقو اس کے حلق پر چل رہا تھا اور کوئی کا چاقو اس کے سینے میں اتر گیا تھا تو کونٹ کے بشرے سے تشکر اطمینان اور سکون کے جذبات ہو رہے تھے۔ جیسے وہ صدیوں کی غلامی کے بعد آج آزاد ہو رہا ہو۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور سرخ افق کے پس منظر میں پہاڑ کی چوٹی پر قدیم اور بوسیدہ دیواروں والا قصر ڈریکولا جیسے سو رہا تھا۔۔۔۔۔ پر ہیٹ اور عظیم۔۔۔۔۔



اس عرصے میں جناح چھکڑے پر سے اتر آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کوئی اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھا اور اس کی انگلیوں کے بیچ میں سے جیتا خون ٹپک رہا تھا۔ وہ زخمی ہو گیا تھا۔ لیکن زخم کی پروا کئے بغیر وہ جناح کی مدد کرنے میں مصروف ہو گیا۔ جو اپنے بڑے چاقو سے تابوت کا ڈھکن کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی پائنتی کی طرف سے ڈھکن کھولنے لگا۔ دونوں نوجوانوں کی انتھک کوششوں کے بعد کیلیں اکھڑ گئیں اور انہوں نے ڈھکن اٹھا کے ایک طرف پھینک دیا۔

خانہ بدوش خاموش کھڑے دیکھتے رہے کیونکہ ڈاکٹر سیورڈ اور آر تھر کی بندوقوں کی ٹالیاں انہیں کی طرف تھیں۔ سورج پہاڑیوں کی چوٹی پر اٹک سا گیا تھا۔ وہ غروب ہونے کے قریب تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ تابوت میں مٹی پر ڈریکولا دراز تھا۔ تھوڑی سی مٹی اس کے بدن پر بھی بکھر گئی تھی۔ کیونکہ جناح نے تابوت چھکڑے پر سے زمین پر لڑھکا دیا تھا۔ کونٹ ڈریکولا کا رنگ موم بنی کی طرح سفید تھا۔ اس کی آنکھیں خباثت سے چمک رہی تھیں اس کی آنکھوں کی اس چمک سے میں واقف تھی۔

کونٹ ڈریکولا نے نظریں کھما کے غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹ فتح مندانہ مسکراہٹ کی صورت میں اس کے نکیلے دانتوں پر کھینچ گئے۔ لیکن عین اسی وقت جناح کے چاقو کا لمبا پھل سورج کی شعاعوں میں چمکا اور دوسرے ہی لمحے وہ کونٹ کے حلق میں دسے تک اتر رہا تھا۔ جناح کا ہاتھ پھر بلند ہوا۔ اور اب وہ کونٹ کو ذبح کر رہا تھا۔ مارے دہشت کے میں چیخ پڑی۔۔۔۔۔ اسی وقت کوئی کا چاقو کونٹ کے سینے میں تیر گیا۔

یہ ایک خواب ہو سکتا ہے یا پھر مجرّم۔ لیکن وہ نہ خواب تھا اور نہ مجرّم تاہم ہم نے حیرت سے دیکھا کہ کونٹ ڈریکولا کا بدن ریزہ ریزہ ہونے لگا۔ اور پھر مٹی ہی کے

پہلا باب

کار ہتھیا جانے والا راستہ شروع سے ہی خراب اور غیر ہموار تھا اور جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا بڑی باقاعدگی سے۔۔۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ بے قاعدگی سے اور بھی زیادہ خراب اور تکلیف دہ بنتا جا رہا تھا۔ اندھیرا اور اداس جنگل راستے کے دونوں کناروں کے زیادہ سے زیادہ قریب آتا جا رہا تھا جیسے اس باقی کچے راستے کو پھل کر اسے معدوم ہی کر دے گا۔ افق کے پس منظر میں دھرتی کی کوہان کی طرح ابھرے ہوئے کالے کالے مہیب سائے گردے اٹے ہوئے سنگلاخ خطے پر پڑ رہے تھے اور اس پورے اداس منظر کو ایسا ہٹا رہے تھے کہ خواہ مخواہ دل پر ہیبت طاری ہونے لگتی تھی۔

کوچ گاڑی کے گھوڑے ٹھوکریں کھا رہے تھے اور گاڑی کے پیچھے غیر ہموار ہڑک پر پڑے ہوئے روڑوں اور پتھروں سے ٹکرا کر سامنے میں بے ہنگم سی گرج پیدا کر رہے تھے، گاڑی بری طرح سے اچھل رہی تھی، اس کا ایک ایک حصہ جیسے احتجاجاً چرچا رہا تھا اور اس میں بیٹھے ہوئے چار مسافر پیندے میں سیدھے بھرے ڈبوں کی طرح دائیں بائیں ڈول رہے تھے اور ان کے سر آپس میں ٹکرائے سے بال بال بچ جاتے تھے۔

ارد گرد کا ویران وحشت انگیز منظر سفر کے ابتدائی حصے میں بڑا مسور کن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ اعصاب پر سوار ہونے لگا تھا۔ منظر کی اداسی اور ویرانی اور اس پر چھائی ہوئی مروہ سی خاموشی اب بیزار کرنے لگی تھی۔ پورے خطے پر دھند لگا چھا گیا تھا اور سائے کا افق اندھیرا اور طوفانی ہو چلا تھا چاروں مسافر اب کسی ہوٹل کے گرم

ایک خوفناک ناول

اور اس واقعہ کے دس سال بعد ڈریکولا کی واپسی

اب ان کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو درد نہ کر رہا ہو اور یہ سب چارلس کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ نہ ضد کرتا اور نہ وہ لوگ اس علاقے میں گھٹے اس کے باوجود کسی نے اسے سرزنش نہ کی شاید اس لئے کہ وہ سب کے سب اپنے حالوں میں پریشان تھے۔ اندھیرا اتر چکا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اس قدر گہرا ہو گیا کہ کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ کوچان راستہ دیکھ سکتا ہے۔ لیکن شاید اس اندھیرے میں بھی، جہاں ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔ اسے شاید راستہ نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ کوچ گاڑی سیدھی سیدھی تاہوار سڑک پر بھاگی جاری تھی اور پھر کوچ گاڑی میں جتے ہوئے گھوڑوں میں ایک گھوڑا احتجاجاً ہنسنا یا کوچان نے کچھ بڑبڑا کر اور کچھ پچکار کر گھوڑے کی حوصلہ افزائی کی، دوسری ہلکی سی ہنسا ہٹ سٹائی دی اور پھر چراتے اور کھڑکھڑاتے ہوئے پیوں کی رفتار کم ہو گئی مسلسل ٹاپوں کی آواز غیر مسلسل ہو گئی اور پھر کوچ گاڑی اچانک رک گئی۔

اور چاروں مسافروں کے دل دھڑکنے لگے اور مختلف قسم کے خیالات ان کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔
”کیا ہوا؟“

”کیا ہم راستہ بھول گئے؟“

”ہم کہاں پہنچ گئے ہیں؟“

”میرے خدا! اب کیا ہو گا؟ اس دیرانے اور اندھیری رات میں ہم کہاں جائیں گے؟“

لیکن کچھ نہ ہوا تھا۔ وہ راستہ نہ بھولے تھے اور نہ ہی انہیں کیس جانے کی ضرورت تھی، کیونکہ وہ پہلی منزل تک پہنچ چکے تھے۔ سامنے سرائے تھی۔ کوچان اپنی نشست سے اتر کر نیچے آگیا تھا اور سرائے کا مالک نانک چندی اینٹوں کے صحن کو

اور روشن کمروں کی آرزو میں بے تاب و بے قرار ہونے لگے تھے۔ وہ اس خاموشی سے آٹا کے ہوٹل کی بھیڑ بھاڑ آوازوں اور قہقہوں اور کھانسی کو تلاش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جانتے تھے کہ گاڑی انہیں جس سرائے کی طرف لئے جارہی تھی اور جہاں انہیں قیام کرنا تھا وہ وی آٹا کے اس ہوٹل کے درجہ کا تو یقیناً نہ ہو گا جہاں ان چاروں نے قیام کیا تھا اور جہاں سے وہ آرہے تھے۔

ان دور افتادہ اور تقریباً ویران علاقوں میں گھسنے کے بجائے اگر انہوں نے اپنی چھٹی کے بقیہ دن بھی چیلے اور جھگڑاتے ہوئے وی آٹا گزار دئے ہوتے تو بہتر ہوتا لیکن چارلس ایک ہی منہلا اور ضدی تھا اور اس نے کہا تھا کہ اگر سیرو تفریح کو چلے ہیں تو ان کی تفریح صرف سیر اور مڑمشی تک محدود نہ رہنی چاہئے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس تفریح کو نہ صرف اور بھی زیادہ دلچسپ بلکہ یادگار بھی بنا دینا چاہئے اس نے کہا تھا کہ وہ چار ہیں اور چاروں ساتھ ہیں چنانچہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں چنانچہ کار ہتھما کی سنگلاخ بلندیوں کی چڑھائی بے حد دلچسپ سفید اور تقریباً سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ اور چارلس کے تین ساتھیوں نے اس کی ضد اور جھٹ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

اور اب وہ اتنی دور آچکے تھے کہ واپس لوٹ جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا چنانچہ اب انہیں نقشے اور راہنما کتاب پر بھروسہ کرنا تھا حالانکہ راستہ جو نقشے میں ہموار اور دلچسپ معلوم ہوا تھا حقیقت میں دشوار گزار اور تکلیف دہ تھا لیکن اب ظاہر ہے کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ راستہ کتنا ہی دشوار گزار اور سڑک کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو انہیں بہر حال اپنا یہ سفر جاری رکھنا تھا۔ چنانچہ اب تو یہ چاروں مسافر صرف یہی چاہتے تھے کہ جلد از جلد سفر کا یہ دور ختم ہو جائے تاکہ وہ اپنے تھکے ہوئے جسم اور درد کرتی ہوئی ہڈیوں کو بستر پر ڈال سکیں۔ اس کبغت سفر نے تو ان کی ہڈیاں ہلا ماری تھیں اور

ہاتھوں میں شراب کے لبریز جام تھے اور آتشان میں بھڑکتے ہوئے شعلے اور شراب ان کے سرد اور تھکے ہوئے جسم میں خوشگوار گرمی پہنچا رہی تھی۔

چنانچہ وہ سستانے لگے۔ یعنی اس میں سے تین سستانے لگے البتہ چارلس کیمسٹ کی رنگوں میں تو گویا پارہ بھرا ہوا تھا اور وہ زیادہ دیر تک مچھلا نہ بیٹھ سکتا تھا یورپ کی سیاحت کے خیال کا بیج اس کے دماغ میں پڑا تھا اور یہ تجویز اسی کی تھی چنانچہ اب وہ اس سفر کے ایک منٹ کو بھی ضائع کرنا نہ چاہتا تھا بلکہ وہ اس تفریح سے جس قدر لطف بھی حاصل کر سکتا تھا کر لیتا چاہتا تھا۔ اس کا شوق جنس غیر تسکین پذیر تھا اور نئے نئے تجربات حاصل کرنے نئے مقامات دیکھنے اور مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے کا اسے ہو کا تھا۔ جب اس کے دوسرے ساتھی ان چوبلی بیچوں پر بیٹھے سستارہے تھے جو آرام وہ تو نہ تھے۔ لیکن جو ڈگر ڈگر لہتے ہوئے بھی نہ تھے تو چارلس اپنی ناپختہ اور غلط جرمی ان نئے لوگوں پر آزاد رہا تھا۔ پہلے اس نے سرائے کے مالک پر اور پھر ان لوگوں پر آزمائی جو اپنی شام گزارنے کے لئے اس سرائے کے ایک کونے میں آ بیٹھے تھے۔ یہ لوگ بڑے ہی کم گو معلوم ہوتے تھے ان میں سے چند مقامی زبان بولتے تھے۔ جس کا ایک لفظ بھی چارلس کے پلے نہ پڑتا تھا۔ دوسرے لوگ کچھ کچھ جرمن زبان جانتے تھے لیکن انکی زبان بھی چارلس کی جرمی کی طرح غلط سلا ٹوٹی پھوٹی اور بے ربط تھی۔ وہ چار ایسے تھے جو اجنبی لوگوں سے بات کرنا ہی نہ چاہتے تھے چنانچہ وہ ایک الگ گروہ بنائے آپس میں ہی بڑے رازدارانہ انداز میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

چارلس نے ان لوگوں کو ایک دودھ اپنی طرف سے شراب پلائی تو انکی بے رخی کھلنے لگی۔ اب وہ چارلس کی طرف دیکھ کے مسکرا رہے تھے۔ وہ چارلس کے ان سے باتیں کرنے کی کوشش پر سر ہلا رہے تھے اور جب ان کے سامنے چارلس کے خرچ

عبور کر کے دفعتاً "بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ کوچ گاڑی کا دروازہ کھول کر اپنے مہمانوں کو خوش آمدید کے انسانوں کے بولنے اور دھڑ دھوپ کی خوشگوار آوازیں سنائی دیں بہت سی کھڑکیاں کھل گئیں اور ان کھلی ہوئی کھڑکیوں اور ایک کھلے ہوئے دروازے میں سے خوف دور کر دینے والی روشنی باہر ہمہ آئی علاقے کی ویرانی یکایک دور ہو گئی یا یوں کہو کہ اس ویران علاقے میں سفر کرنے کے بعد ہمارے یہ مسافر جیسے ایک دم سے سکون بخش نخلستان میں پہنچ گئے تھے جہاں ان کا استقبال کیا جا رہا تھا، جہاں انہیں سردی اور اندھیرے سے پناہ مل سکتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ انہیں کھانا اور آرام بھی مل سکتا تھا۔

مسافروں کے لئے کمرے تیار تھے سرائے چھوٹی سی تھی، اس کی چھت نیچی تھی اور فرنیچر قدیم طرز کا اور پرانا تھا۔ لیکن سرائے کا مالک بے حد مخلص معلوم ہوتا تھا اور ان دیوانے انگریزوں کی ہر خدمت کے لئے بلکہ ان کے قدموں میں بچھ جانے کے لئے تیار تھا۔ جو خدا جانے کیوں اتنی دور آئے تھے۔

گرم پانی کے جگ تیار کئے گئے۔ سرائے کے مالک نے سن رکھا تھا کہ انگریز سب سے پہلے نہانے کی رسم ادا کرتے اور بہت سا گرم پانی استعمال کرتے ہیں۔ مسافروں نے غسل کیا اور اپنے تھکے ہوئے جسموں کو ہسٹر ڈال دیا اور جب تک انکی نکان دور ہو تب تک ان کے لئے کھانا نہ صرف تیار ہو چکا تھا بلکہ میز پر چٹا بھی جا چکا تھا۔

کھانا سادہ مگر لذیذ تھا اور وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر بڑے سے آتشان کے قریب بیٹھ چکے تھے اور اسکی دھواں آلود روشنی اور گرمی میں سستارہے تھے آتشان میں لکڑیاں جھج رہی تھیں اور ان کے یہ چٹائے ہمارے مسافروں کو بڑے ہی سامعہ نواز معلوم ہو رہے تھے کیونکہ اب وہ رات بھر سو کر اپنی تھکن دور کر سکتے تھے۔ کیوں کہ اب وہ سرائے میں تھے۔ اور ان کے پیٹ بھر چکے تھے۔ اور ان کے

سے شراب کے لبالب پیالے رکھے جارہے تھے تو ان کی باجھیں پھٹی جارہی تھیں۔ اور جب سرائے کے مالک نے کاؤنٹر پر ایک بڑی سی مٹل جڑی کشتی رکھ کے چارلس کو ”تھری ڈائنس“ کھینے کی دعوت دی تو ان نے سمجھ لیا کہ اسے اس سرائے میں قبول کیا جا چکا تھا اور یہ کہ لوگوں کی اجنبیت دور ہو چکی تھی کچھ دیر تک سرائے کا مالک اسے اس کھیل کے قواعد و ضوابط سمجھاتا رہا۔ چارلس کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھتا، ہم اس نے بڑے یقین سے سر ہلادیا۔ اور وہ ڈائنس گھمانے لگا۔ وہ سرائے کے مالک اور اس معمر شخص کے سامنے کھیل رہا تھا۔ جس کی نگاہیں گھومتے ہوئے ڈائنس پر کے سفید چمکدار ہندسوں پر سے کسی صورت ہٹتی نہ تھی۔

دوسرے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔

ہیلن کے ابو پر پل پڑ چکے تھے۔ چارلس کو اس پر تعجب نہ ہوا۔ کیونکہ ہیلن کو یہ باتیں پسند نہ تھیں کہ انسان اپنا مقام بھول کر ان لوگوں میں جا بیٹھے جو اس کے قدموں میں بیٹھنے کے قابل نہ ہوں۔ اور پسندیدگی کا اظہار کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔ چنانچہ وہ ابو پر پل ڈال کر چارلس کی ان بے لکفیوں پر ناراضگی ظاہر کر رہی تھی۔

رہا چارلس کا بڑا بھائی الین تو وہ ہر چند کہ اپنے بھائی کی طرف لال لال آنکھوں سے تو نہ دیکھ رہا تھا تاہم چونکہ میٹھا تھا کہ خدا جانے کیا ہو۔

چارلس کو اب بھی یقین نہ آتا تھا کہ وہ اپنے بھائی ایلن اور اس کی بیوی ہیلن کو اپنے ساتھ اس سفر پر لانے میں کامیاب ہو گیا تھا ایلن پیگ کتوس نہ تھا۔ لیکن فطرتاً محتاط ضرور تھا، دونوں بھائیوں کو باپ کی موت کے بعد ایک چھوٹا سا ورثہ ملا تھا۔ اور جب چارلس اپنے حصے کو زندگی کی سرتمیں حاصل کرنے کے لئے خرچ کر رہا تھا..... فضول خرچی سے نہیں بلکہ ایک حد تک کفایت شعاری سے.... تو ایلن اپنے حصے کو مفید کاروبار میں لگا رہا تھا۔ خرچ اور آمدنی کا حساب ہر شام ہوتا اور ایلن جذبات کی رو میں بہہ کر یا جوش میں آکر اپنی مٹی نہ کھول دیتا۔ بلکہ ایک ایک دمڑی چند ٹانویں تک سوچنے کے بعد خرچ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہر قسم کے سیاسی اور غیر سیاسی ہنگاموں سے دور ہی دور رہتا۔ اور کسی بھی بڑے اور چھوٹے خطرے کو سامنے دیکھتا تو کئی کتر اجاتا تھا۔ اس حد سے بڑھی ہوئی احتیاط اور اپنے تلے پن کا اثر اس کے لب و لہجہ پر بھی ہوا تھا چنانچہ اس کی آواز میں ایک قسم کا اکھر پن آ گیا تھا۔ لیکن خود چارلس اپنے بھائی کے اس اکھر پن میں چمپے ہوئے خلوص اور محبت سے واقف تھا۔

ابتداء میں وہ دینی دینی ہنسی ہنستے رہے جیسے شرابا ہے ہوں۔ جیسے اگر زور سے ہنسے تو بد اخلاقی ہوگی لیکن رفتہ رفتہ یہی شرمیلی ہنسی قمقموں میں تبدیل ہو گئی۔ پاپ اور سلکائے گئے اور سرائے کی فضا دیکھتے ہی دیکھتے دھواں دھار ہو گئی۔ کمرہ اور زیادہ گرم ہو گیا۔ شور شرابا اور بڑھ گیا۔

چارلس نے پانے پھینکے اور جیت گیا۔ پھر پھینکے اور پھر جیتا۔
لوگ بڑبڑانے اور ہارنے والے منہ بنا بنا کے کراہنے لگتے چارلس نے شراب
لانے کا حکم دیا اور بنے ہوئے منہ پھیل کے مسکرا اٹھے اور بڑبڑا ہٹ بھی اطمینان اور
خوشی کی سرگوشیوں میں تبدیل ہو گئی۔

اس پہاڑی علاقے کے جنگلوں اور کھیتوں اور چراگاہوں میں دن بھر مشقت کرتے اور عناصر کا مقابلہ کرتے ہوئے سادہ لوگوں کے جھروپوں پڑے، دداڑیں پڑے، چکنے اور جھلسی ہوئی رنگت والے چہرے آگے کی طرف جھک گئے، قریب آگئے اور چارلس کی منتھوں وہ بو پچی۔ جو ان بے نمائے ہوئے، مگر قومی جسموں سے اٹھ رہی

کی۔ اور اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھا۔

”واہ بڑے حاتم ہو تم۔“ ہیلن نے چارلس کی طرف دیکھ کر اور بھونکیں اچکا کر کہا۔

لیکن ڈانکا مسکرا رہی تھی۔ ہیلن کی زبان جیکھی تھی تو ڈانکا کی بے حد شیریں ہیلن کے منہ سے ہمیشہ اور طنز جملے نکلا کرتے تھے لیکن ڈانکا کی ہر بات دل کو خوش کرنے والی اور حوصلہ افزاء ہوتی تھی، ہیلن بے آب و گیاہ صحرا کے پتے ہوئے تکلیف دہ ریت کی طرح تھی ڈانکا۔ وہ نخلستان تھی جہاں چارلس کو سکون، فرحت اور مسرت حاصل ہوتی تھی ڈانکا کے صرف ہونٹ ہی نہیں آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں وہ اپنے شوہر کی ہر صحیح و غلط حرکت کو تفریقی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن ہیلن کی آنکھوں سے غصہ عیاں تھا۔ جیسے وہ جھگڑ پڑنے کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ چارلس کو اپنی بیوی کی جلد بست پسند تھی۔ نرم اور چکنی اور وہ اپنا جسم ہر دفعہ پہلی رات کے سے جوش، شوق محبت و خلوص سے چارلس کے حوالے کر دیتی تھی۔ اور ہیلن۔۔۔ خیر! یہ تو کسی طرح چارلس کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایلن اور ہیلن کبھی ایک دوسرے سے جسمانی لذت حاصل بھی کرتے ہوں گے۔ ایسے خشک مزاج لوگوں کے لئے، جن کی زندگی کا پہلا اور آخری مقصد روپیہ بچانا ہو کسی بھی قسم کی لذت کوئی معنی نہیں رکھتی اور زندگی کی آسائشیں انہیں خواہ مخواہ کے چو نچلے معلوم ہوتے ہیں۔

ڈانکا نے بڑی صفائی، پیار اور پیاسے کی طرح اپنا پیالہ چارلس کی طرف بڑھا دیا۔ اور موخرالز کرنے صراحی جھکا کر اسے لبالب بھر دیا۔ صراحی اور پیالے کے لب ایک طویل بو سے کے بعد علیحدہ ہوئے تو چارلس ہیلن کی طرف گھوم گیا۔ لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”بہت زیادہ خرچ کرتے ہو تم“ وہ بولی ”آخر حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ ایسا بھی

رہی چارلس کی بھابی ہیلن تو اسے ایلن کی بیوی بنے سات یا آٹھ سال ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ اب بھی بڑی عمر کی کنواری یعنی غیر شادی شدہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی عمر تیس برس سے تجاوز کر چکی تھی اور وہ ہر طرف اور وہ پہلو سے خاص قبول صورت تھی، لیکن خدا جانے کیوں وہ اپنے بالوں کو پیچھے کی طرف بڑے ظالمانہ انداز سے کھینچ کر ان کا جوڑا باندھتی تھی اور اس وجہ سے اس کا چہرہ ستا ہوا اور وہ خود معمر معلوم ہوتی تھی اس کے ہونٹ ویسے ہی پتلے تھے۔ پھر ہیلن کی یہ بری عادت تھی کہ وہ انہیں ناپسندیدگی سے اپنے دانتوں میں کھینچ دیا جی یا یوں کہنے کہ انہیں چوسا کرتی تھی۔ چنانچہ وہ اور بھی پتلے معلوم ہوتے تھے۔ ہیلن کے خیالات اپنے شوہر کے خیالات سے مختلف نہ تھے چنانچہ وہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی کفایت شعاری کی تعریف کر کے اسے اور بھی کفایت شعار بنا رہی تھی۔ اور اس نے اپنی زندگی کے لئے جن سخت اصولوں کی تنظیم کی تھی۔ ہیلن اسے بھی ہوا دیتی تھی۔ چنانچہ جب چارلس اور اس کی بیوی ڈانکا نے اس سے کہا کہ وہ اور ایلن بھی ان کے ساتھ سفر کو چلے چلیں تو ہیلن نے انکار کر دیا۔ لیکن خدا جانے کیا بات ہوئی کہ زندگی میں پہلی دفعہ ایلن نے اپنی بیوی کی مخالفت کی اور اپنی زندگی کی مخصوص ڈگر سے ہٹ کر وہ چارلس اور ڈانکا کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ چنانچہ ہیلن بھی تیار ہو گئی اور اس وقت ہیلن اور ایلن کا ہتھما کے ایک دور افتادہ اور انجان خطے کے ایک چھوٹی اور سستی سرائے میں آشدان کے قریب ڈانکا کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور یہ واقعی حیرت انگیز اور ناقابل یقین سی بات تھی۔

اور اب چارلس کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ نئے نئے دوست بنانے اور انہیں شراب پلانے کی خوشی میں وہ اپنے مسافروں کو اور ان کے خالی پیالوں کو بھول ہی گیا تھا۔ چنانچہ اس نے جلدی سے پتھر کی بھری ہوئی صراحی سرائے کے مالک سے حاصل

وہ لوگ نصف فاصلہ طے کر کے کمرے کے بیچ میں پہنچے تھے کہ دفعتاً "بڑے زور سے سرائے کا دروازہ کھلا اور رات کی تیز اور سرد ہوا کا ایک جھکڑ اندر دھنس آیا اور کمرے میں چھایا ہوا آتش ان کی لکڑیوں اور سگریٹوں کا دھواں جھکڑ کے اس فوری ہلے کی تاب نہ لا کر ایک دم سے چھت کی طرف اٹھا ایک چوڑے شانوں والا طویل القامت شخص دروازے میں کھڑا ہوا تھا اس نے راہبوں کا لباس پہن رکھا تھا اور وہ دروازے میں کھڑا گاہکوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس ملائمت کے برخلاف جو راہبوں سے مخصوص ہے اس شخص کے بشرے سے کرخنگی اور آنکھوں سے حقارت عیاں تھی گویا وہ ان لوگوں کو جو اس وقت سرائے میں موجود تھے، ذلیل سمجھ رہا ہے اس نے ایک ٹانگ سے ٹھوکر مار کر دھڑ سے دروازہ بند کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سرائے کے بالک کی طرف بڑھا۔



کیا کہ آدمی آگے پیچھے کا خیال ہی نہ کرے، اور تم جانو یہ لوگ بھی، جنہیں تم اتنی بہت سی شراب پلا رہے ہو تمہاری اس۔۔۔ کیا کہتے ہیں۔۔۔ سخاوت کو پسند نہیں کرتے۔" اور اس نے ایک بار پھر سر ہلا کر سرائے کے پورے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ لوگ تمہیں بیوقوف سمجھتے ہیں۔"

"میں جو کچھ کرتا ہوں خود اپنی تسکین اور اپنے مزے کے لئے کرتا ہوں۔ یعنی کسی اور کے لئے نہیں۔" چارلس نے بڑی رکھائی سے کہا اور ایلن کی طرف گھوم کر پوچھا۔ "کیوں بھی؟" آپ کو میری بے محل سخاوت ناپسند ہے؟" ایلن مسکرایا۔

"چارلس! تمہاری کسی بھی حرکت اور کسی بھی کام پر پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا فتویٰ صادر کرنے کی عادت میں ایک عرصے سے ترک کر چکا ہوں" وہ بولا۔ "حماقت بہر حال حماقت ہے۔" ایلن نے کہا۔

ڈانٹا نے ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور مسکرا کر چارلس کی طرف دیکھا۔ یہ ان دونوں کی مخصوص مسکراہٹ تھی، خفیہ، محبت سے بھرپور اور پر معنی۔ اس مسکراہٹ کو صرف چارلس سمجھ سکتا تھا۔

"میرے خیال میں اب ہمیں سونا چاہئے چلکر" ڈانٹا نے کہا "کیونکہ صبح سب کو جلد اٹھنا ہے۔"

"کیا لگتی کوچ گاڑی ہے وہ بھی جس میں ہم سفر کر رہے ہیں۔ میرا تو ایک ایک جوڑ درد کر رہا ہے۔" ایلن نے کہا اور اس خوف سے وہ اٹھ کھڑی ہوئی کہ کہیں یہ لوگ اپنا خیال نہ بدل دیں "اس گاڑی میں دوبارہ سوار ہونے سے پہلے کم از کم میں تو لمبی تین کے سونا چاہتی ہوں۔"

میں جھونک دیا۔

سرائے کے مالک نے جلدی سے ایک بوڑھے شخص کی طرف دیکھا، پھر دوسری طرف اور پھر راہب کی طرف دیکھا۔

”فادر شینڈور۔۔۔“ اس نے کہنا شروع کیا،

”خدا جانے کیا گویہ بھرا ہے، تمہاری موٹی کھوپڑیوں میں“ راہب جس کا نام شینڈور تھا کرجا۔ ”کہ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟ وہ معاملہ ختم ہوا۔۔۔ وہ عفریت نہیں رہا۔۔۔ اس کے خاتمہ کو ایک نہ دوپورے دس برس ہو چکے۔“

سرائے کا یہ کمرہ جو چند منٹ پہلے خوشی کی آوازوں اور قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ اب قبر کی طرح خاموش تھا۔ وہاں موجود ہر شخص کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں، وہاں موجود ہر شخص کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ہر شخص سانس روکے کھڑا تھا۔

”آج رات“ فادر شینڈور غصے میں چیخا ”آج ہی رات کو میں نے ایک بچی کی لاش کو مسخ ہونے سے بچایا ہے برابری وحشیانہ پن ہے یہ تو وہ لوگ اس لاش کے سینے میں کھوٹا ٹھونکنے جارہے تھے کہ اتفاقاً میں وہاں پہنچ گیا اور میں نے سختی سے اور جبراً انہیں لاش کی بے حرمتی کرنے سے روک دیا۔ کس قدر جاہل ہو تم لوگ۔ اور جب یہ کارروائی کی جارہی تھی تو ایک پادری بھی وہاں موجود تھا۔ اس کبیرت کی اجازت سے ہی اس بچی کی لاش کے سینے میں کھوٹا ٹھونکا جا رہا تھا۔ یہ انتہا ہے کیا تم لوگ کبھی اپنے آپ کو اس بیچا خوف اور وہم سے آزاد نہ کر سکو گے؟ وہ عفریت اب نہیں رہا۔ اس کے خاتمے کو دس برس کا عرصہ گزر گیا۔ بیوقوفوں۔“

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سب کے سب نظریں جھکائے خاموش کھڑے

چنانچہ فادر شینڈور غرا کر اور دانت پیس کر آشدان کے اور بھی قریب ہو گیا اور

”شکر اور گرم مصالحہ ڈال کر میرے لئے عمدہ سرخ شراب کی بوتل لے آؤ یا ہر موسم اس قدر خراب ہے کہ کوئی جانور بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ بولا۔

سرائے کے مالک کو یہ حکم دیکر وہ آشدان کی طرف گھوم گیا اور چمت کی ایک شہتیر سے لٹکی ہوئی کسی چیز سے اس کا سر ٹکرایا یہ لسن کے غنچوں کا ایک گلدستہ سا تھا۔ جو شہتیر سے بندھی ہوئی ایک رسی کے دوسرے سرے سے بندھا لٹک رہا تھا۔ راہب نے غصے کی ایک غراہٹ کے ساتھ ہاتھ بدھا کر وہ گلدستہ گھسیٹ لیا۔ اور بڑے غصہ کے عالم میں اسے فرش پر دے مارا۔

”ہم! اس عفریت کو دور کرنے کے لئے یہ لسن؟“ وہ بولا۔ ”میں کتا ہوں اب وہ عفریت نہیں رہا۔ اور اگر ہے تو پھر یہ تمہارا ٹوٹکا اسے روک نہیں سکے گا۔“

اس نے جھک کر لسن کے غنچوں کا گلدستہ فرش پر سے اٹھایا اور اسے آشدان

”ہاں بیٹے۔ سنجیدگی سے حاصل کرتا یا حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“
فادر شینڈور نے کہا۔

”حالانکہ آپ راہب ہیں؟“ چارلس نے کہا۔

”ہاں۔ حالانکہ میں راہب ہوں لیکن تارک الدنیا نہیں ہوں کہ زندگی کی آسائشوں سے اپنے آپ کو الگ کر لوں۔“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”سنو صاحبزادے! اس فانی دنیا میں جتنی بھی سرسبزی حاصل کر سکتے ہو کر لو کیونکہ دوسری دنیا کا قویہ ہے کہ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ یعنی وہاں اس دنیا کی سرسبزی کہاں حاصل ہو گی؟ یا پھر بہت کم ہوں گی۔“

ہیلن نے فادر شینڈور کے اس کفر پر دہلی زبان میں اعتراض کیا تو فادر کا سر آہستہ سے اس کی طرف گھوم گیا۔

”بانو! کیا امکان ہو گا وہاں؟ ایس کیسا ہو گا؟ دونوں؟ اس کا ایندھن اور اس کے شعلے یا۔۔۔۔“ اور اس نے اپنی گھنی بھونکیں اچکا کر نگاہیں چھت کی طرف اٹھا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں آتشدان کے سامنے اپنی دم گرم کرنے اور اس وقت سرائے کا مالک شراب لیکر آیا تو فادر شینڈور نے اپنا مضبوط بازو اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”اور مصالحہ دار شراب پینے کی سہولت تو میسر نہ ہو گی۔ یہ تو عارضی چیزیں ہیں۔ اور ہم ان سے اسی دنیا میں لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ وہاں نہ تو چوڑے ٹھنڈے پڑ جائیں گے کہ انہیں گرم کیا جاسکے اور نہ سرد ہوائیں چلیں گی کہ مصالحہ دار شراب سے لطف اندوز ہوا جاسکے۔ ہاں تو کیا اب میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ چار خوش باش انگریز کارہتھما میں کیا کرنے تشریف لائے ہیں؟“

چنانچہ چارلس نے پہلے رسم تعارف ادا کی۔ پہلے اس نے اپنا پھر اپنی بیوی ڈانٹا، اپنے بھائی ہالین اور اپنی بھالی ہیلن کا تعارف کرایا۔ فادر شینڈور ہر ایک کے سامنے

اب پہلی دفعہ اسے اس سرائے میں چار اجنبیوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ایک لمبے تھکاوہ بڑی ناقدانہ نگاہوں سے ان کا جائزہ لیتا رہا۔ اور پھر اس کے بشرے کی کرخمک دھشتا، ملاحت میں اور تند خوئی بشارت میں تبدیل ہو گئی وہ ڈانٹا کے سامنے بڑے اخلاق سے جھک گیا اور موخر الذکر جواب میں مسکرا دی، اب فادر شینڈور ہیلن کی طرف گھوم گیا۔ وہ بدستور ماتھے پر پل ڈالے اور ہونٹ بچھینے خاموش کھڑی رہی۔

”ہا۔ آ۔“ فادر شینڈور کمرے کی طرف منہ اور آتشدان کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ اپنا چہرہ ایک جھٹکے کے ساتھ اوپر اٹھایا اور اپنے کولھے سینکنے کے بعد بولا۔ ”اب کچھ سکون ملا۔ یہ بھی غیبت ہے کہ کولھوں کو گرم کرنے کا سامان یہاں موجود ہے ورنہ وہ تو برف کے تودے ہی بن گئے تھے۔“

”بڑا ہی دیدہ دلیر اور منہ پھٹ قسم کا مگر کافی مضبوط شخص ہے“ چارلس نے سوچا۔ راہب ہوتے ہوئے بہادر اور دلیر ہے اور ان لوگوں میں سے ہے جو بے جھجک اور تن تنها دنیا کا اور ہر خطرے کا مقابلہ کر لیتے ہیں۔ اور ذہن بھی خوف زدہ نہیں ہوتے اور پھر یہ ان لوگوں میں سے بھی ہے جو بے دھڑک بیان کر دیتے ہیں اور سامنے والے سے نہیں ڈرتے اور نہ ہی اس کے جذبات کا خیال کرتے ہیں کیونکہ حقیقت، ہر حال حقیقت ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ قابل تعریف اور پر قوت شخص ہے یہ فادر شینڈور لیکن اس کا قرب خواہ مخواہ انسان کو بے چین کر دیتا ہے۔

”واہ! میرے لئے زندگی کی صرف چند ہی سرسبزی باقی رہ گئی ہیں۔ اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ بے حد لطف آ رہا ہے“ فادر شینڈور نے اپنا کولھوں پر ہاتھ بارا۔ ”فادر!“ چارلس نے پوچھا۔ ”کیا واقعی آپ زندگی کی سرسبزی سنجیدگی سے حاصل کرتے ہیں یا محض زبانی جمع خرچ ہے؟“

بڑی شائستگی سے جھک گیا۔ شراب کی ایک چسکی لی، غالباً معاملہ ٹھیک سے حل نہ ہوا تھا چنانچہ پیالے کو دو چار جھکولے دیئے اور پھر بولا۔
 ”اور مجھے فادر شینڈور کہتے ہیں کیلن برگ کی راہبوں کی خانقاہ کا صدر یعنی ایبوت ہوں۔“

اور چارلس نے دماغ پر زور دے کر اس نقشے کی تصویر بنالی۔ جسے وہ لوگ اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اور اس پورے سفر میں بھی دیکھتے رہے تھے لیکن اسے یاد نہ آیا کہ اس نے یہ نام اس نقشے میں کسی جگہ نہ دیکھا تھا۔
 ”کیلن برگ! کہیں قریب ہی ہے یہ جگہ؟“ اس نے پوچھا۔
 ”نہیں۔ کافی دور ہے یہاں سے۔“ فادر شینڈور نے اپنا سر شراب کے پیالے پر جھکا کر اس کی بھاپ زور سے ناک میں کھینچی اور پوچھا ”کہاں سفر کو چلے ہو؟“

”جی نہیں کچھ پہاڑ پر چڑھیں گے اور کچھ میر کریں گے۔“ چارلس نے جواب دیا
 ”سفر وسیلہ ظفر ہے۔۔۔۔۔ کم سے کم ہم نے تو یہی سنا ہے۔ سفر سے آدمی کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی لوگ ایسا ہی کہتے ہیں۔“

”بہت خوب۔ لیکن تم جس علاقے میں سفر پر چلے ہو اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟ ان دیرانوں میں تم کہاں وسیلہ ظفر تلاش کرو گے اور یہ جاہل لوگ تمہارے علم میں کیا اضافہ کریں گے؟“

اور فادر شینڈور نے سرائے میں بیٹھے اور کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

”اپنے مریدوں کے متعلق آپ کے خیالات کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔“
 ”یہ میرے مرید نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں انہیں برداشت بھی نہیں کر سکتا۔ ان کی صورتوں تک سے بے زار ہوں۔ اور پھر یہ لوگ میرے ماتحت نہیں ہیں۔ اور

میں ان کی خبر گیری نہیں کرتا۔ اور یہ ان لوگوں کی بد قسمتی ہے وہاں کیلن برگ میں جنہیں ایسے تو ہم پرست، جاہل اور رجعت پسند لوگ نہ ملیں گے، میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں آجاؤ۔ خانقاہ میں قیام کر سکتے ہو۔ خانقاہ کے برادر تمہاری خاطر ودارات میں کوئی کسر اٹھانہ رکھیں گے۔“

فادر شینڈور کی اس دعوت نے چارلس کا دل موہ لیا۔ بے حد دلچسپ تجربہ ہوگا۔ یہ اور انوکھا بھی اور پھر چارلس کو یہ بھی احساس ہوا تھا کہ خود شینڈور بے حد دلچسپ اور رنگارنگ قسم کا آدمی ہے۔ چنانچہ کیلن برگ کی خانقاہ میں ان کا قیام یادگار رہے گا۔ فادر شینڈور نے اپنی باتوں سے ایک نئی اور زالی دنیا کے دروازے ان کے لئے کھول دے گا۔

چنانچہ چارلس نے کہا۔ ”خیال تو بے حد عمدہ۔۔۔۔۔“
 ”ہم فادر کی یہ دعوت نہیں قبول کر سکتے“ ہیلن نے سختی سے کہا۔
 ”کیوں؟“ چارلس نے پوچھا۔

”اس لئے کہ ہمارا پروگرام جو پہلے سے بن چکا ہے ہمیں اس راستے سے ادھر ادھر ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔“

”اب بھی، ایسی بھی بے مروتی کیا۔“ چارلس نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ پروگرام سے ذرا سا انحراف۔“

”چارلس! تم پاگل ہو گئے ہو۔“ ہیلن نے کہا۔
 ”اس میں پاگل ہونے کی کیا بات ہے بھائی۔ دراصل۔۔۔۔۔“

”دراصل یہ کہ“ ہیلن نے فیصلہ کن انداز میں کہا ”کل ہم جوزف باد کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔“

یہ نام سنتے ہی فادر شینڈور چونکا۔

”کیا کما تم نے کہ کہاں جا رہے ہو؟ تم لوگ“ اس نے پوچھا۔

”جوزف باد۔“

”ہم۔ مناسب ہوگا۔ کہ تم اپنا راستہ بدل دو۔“ اس نے بڑی سخت آواز میں کہا۔

اور اس کا لہجہ ایسا ٹھکانہ اور اس کا حکم ایسا خلاف توقع تھا کہ ہیلن گھبرا کر اختیار کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اگر کسی نے اس کے گال پر اچانک چائنا رسید کر ہوتا۔ تب بھی وہ اتنی نہ بوکھلائی، ایلن ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ ایسے موقع پر وہ اپنی بیوی کی مدد کو دوڑ آتا تھا۔

”قادر! آپ کی دعوت کا شکریہ“ ایلن نے کہا ”بیشک ہم اسے قبول کر لیتے، لیکن افسوس ہے ہم روانہ ہونے سے پہلے مکمل پروگرام بنا چکے تھے اور اب اسے تبدیل کرنا خلاف عقل۔۔۔۔۔۔“

”اسے تبدیل کرنا نہیں بلکہ اس سے چپکے رہنا خلاف عقل ہے۔“ قادر شینڈور نے کہا۔ ”میں تم کو کیلن برگ آنے پر مجبور نہیں کرتا یہ تمہارا معاملہ ہے۔ اور تم اپنی مرضی کی مالک ہو، جی چاہے وہاں آؤ اور جی چاہے تو کہیں اور چلے جاؤ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جوزف باد نہ جاؤ۔“

”ہم نے سنا ہے کہ بے حد خوبصورت جگہ ہے وہ“ ڈائنا نے کہا۔

”ہاں ہاں۔ لیکن بلائیں اور آئیں بھی خوبصورت ہیں“ قادر شینڈور نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ ڈائنا نے پوچھا۔

”۱۔ لروپا۔ بلا دو نا۔“ قادر شینڈور بڑبڑایا۔

”۲۔ لروپا۔ بلا دو نا! وہ کیا ہوتا ہے ایلن؟“ ہیلن نے سرگوشی میں پوچھا۔

”اس کے لفظی معنی تو ہیں رات کا مہیب جان لیوا سایہ، لیکن اس سے پادری کی

کیا مراد ہے، یہ میں نہیں جانتا۔“ ایلن نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

”میری مانو اور جوزف باد جانے کے ارادے ترک کر دو۔“ قادر شینڈور نے کہا۔ ”لیکن قادر شینڈور! ہم لوگ اناڑی نہیں بلکہ تجربہ کار چڑھنے والے ہیں۔“ چارلس نے اسے یقین دلایا۔

”بیٹے! پہاڑ پر چڑھنے اترنے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے تم مجھے ایک سنگی پادری سمجھ رہے ہو گے اور یہ بھی خیال کر رہے ہو گے کہ میں اپنے راہبوں کے لباس تک کا خیال نہیں کرتا اور یہ تمہارا خیال ایک حد تک صحیح بھی ہے لیکن میاں! میں چاہوں تو سنجیدہ بھی بن سکتا ہوں اور اس وقت میں سنجیدہ ہی ہوں مناسب ہوگا کہ تم لوگ جوزف باد سے دور ہی دور رہو۔“

”کیوں؟“

”اگر میں نے تمہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا تو شاید بلکہ یقیناً تم اس پر یقین نہ کرو گے۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک ہے لیکن شاید یہ ہوگا کہ سب کچھ سن لینے کے بعد تم اسے ایک چیلنج یقین کرتے ہوئے وہاں جانے کے لئے بے چین ہو جاؤ گے اور اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔ اس سرائے میں موجود کسی بھی شخص کے سامنے تم جوزف باد کا نام لو اور تم دیکھو گے کہ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا ہے۔ یہ لوگ ایک ناقص راکٹ میں بیٹھ کر چاند پر جانے کے لئے تو تیار ہو جائیں گے لیکن جوزف باد کبھی نہ جائیں گے اور ان لوگوں کو دو سرے لوگ کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، جو جوزف باد کے آس پاس رہتے ہیں۔“

”لیکن کیوں؟“

”بس یہ نہ پوچھو۔ البتہ اتنا ضرور سن لو کہ کوئی تمہاری مدد نہ کرے گا کوئی تمہیں دش آئد نہ کرے گا اور اگر خدا نخواستہ کچھ ہوا تو بہت برا ہوگا۔“

”کیا ہے۔“

چارلس جانتا تھا کہ یہ ایلن نے غلط نہ کہا تھا اس نے بڑی تفصیل اور باریک بینی سے اس نقشہ کا مطالعہ کیا تھا، اور ایک ایک راستہ، ایک مقام اور ایک ایک عمارت جو نقشے میں بتائی گئی ہے، اس کے ذہن میں محفوظ ہے۔

”نقشے میں نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ قعر سرے سے ہی نہیں“ شینڈور نے کہا۔ بہر حال اس قعر کے قریب نہ جانا اور اس نے جھک کر پہلے دونوں عورتوں کو اور پھر دونوں مردوں کو سلام کیا اور پلٹ کر دروازے کی طرف چل دیا، دروازے کے قریب چند لوگ کھڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے شینڈور کو آتا دیکھ کر وہ اسے راستہ دینے کے لئے دائیں بائیں ہٹ گئے۔

فادر شینڈور نے یوں جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھولا جیسے کواڑ کو چلوں سمیت اکھاڑ کر پھینک دے گا۔ وہ باہر نکل گیا اور دروازہ یوں دھڑ سے بند کیا گیا کہ کواڑوں کا نہ صرف چوکھٹا بلکہ چھت کے شہتیر بھی ہل گئے کچھ ہی دیر بعد گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی جو دور ہونے لگی دور ہو کر دم ہونے لگی۔ اور پھر خاموشی میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئی۔

سرائے میں سکون اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہاں موجود ہر شخص نے جیسے خطرہ ٹل جانے کے بعد اطمینان کا سانس لیا ہو لوگوں کے ہونٹ ہلے اور خاموشی کمرہ رفتہ رفتہ ایک بار پھر آوازوں سے پر ہو گیا، سرائے کا مالک صراخیاں اور خالی پیالے سینے لگا۔

”لینڈلارڈ! ایلن نے سرائے کے مالک سے پوچھا ”فادر شینڈور نے ایک قعر کے متعلق کچھ کہا تھا، تم جانتے ہو کہ یہ قعر کیسا ہے اور کہاں ہے؟“

سرائے کے مالک نے چونک کر نکلیوں سے ایلن کی طرف دیکھا۔

”اس علاقہ میں اور بھی بہت سے حسین مقامات ہیں۔ ان کی سیر کرو اور لطف اٹھاؤ۔ لیکن اس مقام کے قریب تک نہ جاؤ۔“

”جیسا کہ آپ نے کہا فادر۔“ چارلس بولا۔ ”یہ ہمارے لئے ایک چیلنج ہی ہے۔“

فادر شینڈور زخمی شیر کی طرح غرایا، اس کی آنکھوں سے شدید غصہ عیاں ہو گیا اور اس نے خالی پیالوں اٹھایا۔ جیسے اسے بڑے زور سے سامنے کی دیوار پر دے مارے گا۔ لیکن پھر چنچا۔

”لینڈلارڈ۔“

سرائے کا مالک دوڑا آیا اور اس نے فادر شینڈور کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا۔

”تمہارے سرائے کے اصطبل کے محافظ کے پاس میں اپنا گھوڑا چھوڑ کر آیا ہوں۔“ فادر شینڈور نے بڑی شاہانہ شان سے کہا۔ ”اس سے کہو کہ میرا گھوڑا دروازہ پر لے آئے۔“

سرائے کا مالک اس حکم کی تعمیل کے لئے روانہ ہو گیا تو فادر شینڈور پھر انگریز مسافروں کی طرح گھوم گیا۔

”تم لوگوں سے مل کر مجھے خوشی حاصل ہوئی ہے خدا تمہیں حفظ و امان میں رکھے، کاش کے تم لوگوں نے میرے مشورے پر عمل کر کے جوزف باد جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہوتا۔“ اور اس نے اپنے چوڑے کندھے اچکائے لیکن اگر تم میرے مشورے پر عمل نہیں کر رہے ہو، تو نہ سہی جاؤ۔ لیکن خدا ارادہ قعر سے دور ہی رہنا۔ بھولے سے بھی اس کے قریب نہ جانا۔“

”قعر!“ ایلن نے کہا۔ ”کون سا قعر؟ نقشے میں تو کوئی قعر نہیں ہے؟“ اگر ہو تو میری نظر سے پوشیدہ نہ رہتا، کیونکہ آپ جاننے میں نے بڑے غور سے اس کا مطالعہ

کر رہی تھی کہ وہ آجائے تو دونوں اپنے کمرے کی طرف چل دیں
”ہم کیا؟“ ہیلن نے تیز نظروں سے چارلس کی طرف دیکھا۔

”ہم یہ بھابی کہ اگر۔۔۔ اگر۔۔۔ واقعی وہ قعر موجود ہے۔ جس کا ذکر شینڈور نے
کیا ہے اور اگر وہ ہمارے راستہ میں ہی پڑتا ہے یا اگر راستہ سے بہت زیادہ ہٹ کر
نہیں ہے تو لگے ہاتھوں اس کی بھی سیر کر لی جائے“ آوہا ایک گھنٹہ ادھر ادھر ہو بھی گیا
تو اس سے کچھ زیادہ فرق نہ پڑے گا ایک تاریخی قعر ہی ہم دیکھ لیں گے اور کیا۔



”قعر؟“ وہ بولا۔

”ہاں جوزف باد کے قریب ہے کہیں۔“

سرائے کے مالک کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ بے چین اور خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔
”میں کسی قعر سے واقف نہیں ہوں۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب

دیا۔

صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا سرائے کا مالک یقیناً اس قعر سے جس کا
ذکر شینڈور نے کیا تھا۔ واقف تھا لیکن وہ اس کے متعلق کچھ کہتا تو ایک طرف رہا۔
اس کے متعلق سوچتا بھی نہ چاہتا تھا چنانچہ اس خوف سے کہ یہ مسافر اس پر اسرار قعر
سے متعلق کچھ اور نہ پوچھ بیٹھیں وہ قصداً وہاں سے ٹل گیا۔

”یہ اس قدر خوف زدہ کیوں ہو گیا؟“ ڈانکا نے پوچھا۔

”شینڈور کو دیکھ کر سب ہی خوفزدہ ہو گئے تھے۔ غالباً اس سے ہر شخص ڈرتا
ہے۔“ چارلس نے کہا۔

ہیلن نے کہا۔ ”اگر ہمیں وقت پر جوزف باد پہنچنا اور وہاں تفریح۔۔۔“

”لیکن۔۔۔“ چارلس نے سر کھلایا۔

”لیکن یہ کہ ہمارے پاس اتنا وقت تو نہیں ہے کہ راستہ میں رک کر ان قعروں
کو تلاش کرتے پھریں جن کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔“ ایلن نے اپنی بیوی کے دلکی
بات کہہ دی۔

”ہم شروع میں ہی اپنا پروگرام بن چکے اور وقت کا تعین کر چکے ہیں۔“

ہیلن بولی۔ ”اور ہمیں آخر تک اس پر عمل کرنا ہے۔“

”ہم۔“ چارلس نے سر ہلایا۔

اور اس نے ڈانکا کی طرف دیکھا جو زینہ کے قریب کھڑی اپنے شوہر کا انتظار

ملوائیں سنائیں اور کوچ گاڑی کا ایک طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

دوسرا دروازہ کھول کے الین نے اپنی روانی مشن سے باہر قدم رکھا وہ نہ تو غصہ کا اظہار کر رہا تھا اور نہ بے چینی کا۔

”اب کیا ہوا۔“ چارلس نے غصہ دبائے کے لئے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھیج لیں۔

”میں آپ لوگوں کو اسی جگہ اتار رہا ہوں۔ ٹھیک ہے؟“ کوچوان نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

”کیا۔ آ۔ آ۔!“ چارلس چیخا۔

”آپ لوگ اسی جگہ اتر جائیں گے صاحب۔“ کوچوان بولا۔

”یعنی یہ کیا مذاق ہے! ہم ”یہاں کیوں اترنے لگے؟“ چارلس نے حیرت سے کہا۔ ”اور تم ہمیں یہاں کیوں اتارنے لگے؟“

چارلس نے چاروں طرف دیکھا۔ چوراہے سے ہٹ کر کسی لکڑہارے کی جھونپڑی نظر آئی۔ لیکن وہ خالی پڑی تھی۔ دور دور تک کسی آبادی اور کسی انسان کا پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف عجیب ویرانی اور وحشت برس رہی تھی معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہاں کبھی کوئی آیا نہیں، کھل ترین خاموشی بل کھاتا ہوا راستہ اور اندھیرا آسمان جو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جھکا آ رہا ہو۔

”یہ جوزف باد تو نہیں ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”یہاں یا تو کچھ گڑبڑ ہے۔ یا پھر ہم میں جو کچھ طے ہوا ہے وہ صاف نہ تھا۔“ الین نے کہا ”چنانچہ اب مناسب ہو گا کہ ہم ساری باتیں صاف کر لیں۔ غالباً ہم نے تم سے یہ طے کیا تھا کہ ہمیں جوزف باد پہنچا دو گے ٹھیک ہے؟“

”ٹھیک ہے“ کوچوان نے کہا۔

ایک چوراہے پر ان کی کڑکڑاتی ہوئی کوچ گاڑی دھنسا ”رک گئی یہ چوتھی دفعہ گاڑی روکی گئی تھی اس سے پہلے بھی تین دفعہ کوچ گاڑی راستہ میں بے وجہ ہی رکی تھی جس کی وجہ سے کوچوان نے گاڑی روک لی ہو البتہ ایک دفعہ گاڑی روکنے کی وجہ جلد ہی ظاہر ہو گئی تھی۔ گاڑی کا ایک پیہ راستہ کے کنارے والے کھڈ میں پھنس گیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ایک نہ دو پورے چار گھنٹوں کی تاخیر کے بعد وہ لوگ آگے روانہ ہو سکے تھے۔

لندن میں بیٹھ کر ان لوگوں نے جو پروگرام بنایا تھا اور جس طرح وقت کا تعین کیا تھا کہ اتنے بجے فلاں مقام سے روانہ ہو کر اتنے بجے تک فلاں مقام پر ضرور پہنچ جائیں گے سو اس پر ٹھیک سے عمل کرنا کم سے کم اس علاقہ میں تو ممکن نہ تھا۔ پروگرام بناتے وقت راستہ کی دقتوں، گاڑی کے ٹوٹنے پھوٹنے یہاں کے لوگوں کی بے مروتی اور عدم تعاون کا ان مسافروں نے خیال ہی نہ کیا تھا اور اس کا خیال کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہر جگہ ان کا استقبال کیا جائیگا لوگ بڑی مہمان نوازی اور تعاون کا ثبوت دیں گے اور وہ لوگ بڑے مزے سے بلانا خیر اور کسی بھی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکیں گے۔ لیکن ان کے یہ سب اندازے غلط ثابت ہو رہے تھے۔

”کوچوان کو خدا جانے کیا ہو گیا تھا۔ کہ وہ خواہ مخواہ دیر کر رہا تھا“ وقت اور بے وقت اور بلا وجہ گھوڑوں کی لگائیں کھینچ کر گاڑی روک لیتا تھا وہ پاگل تو معلوم نہ ہوتا تھا پھر کیا وجہ تھی کہ اب یہ چوتھی دفعہ اس نے گاڑی روک دی تھی۔“

چارلس اب برداشت نہ کر سکتا تھا اس نے دانت پیسے، منہ میں کوچوان کو دو چار

”تو پھر۔۔۔؟“

”تو پھر یہ کہ آپ وہاں پیدل جاسکتے ہیں جوزف بادیاں سے دور نہیں ہے۔“

”کیا۔۔۔ آ۔۔۔؟“

”صرف دو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔“ کوچوان نے کہا۔

”پیدل جاسکتے ہیں!“ چارلس نے کہا۔ ”کوچوان! تمہاری عقل ٹھکانے پر ہے کہ

نہیں؟“

”میری عقل تو ٹھکانے پر ہے صاحب۔ لیکن آپ کی نہیں ہے۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟۔۔۔ یعنی۔۔۔ کوئی دم میں اندھیرا اتر آئے گا۔“

”اندھیرا۔!“ کوچوان کانپ گیا۔

اور اس نے سر اٹھا کر اندھیرے آسمان کی طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ کوچوان کی یہ گستاخی بے چمن کو دینے والی تھی، چارلس نے اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی کھینچ لی۔ اس کا ارادہ تھا کہ کوچوان پر چھلانگ لگا دے اور اسے نیچے گھسیٹ کر مارے گھونسوں سے اس کی عقل ٹھکانے لگا دے لیکن کوچوان شاید اس کے ارادے سے واقف ہو چکا تھا چنانچہ اس نے چابک گھسیٹ کر سر سے بلند کر لیا اور وہ چارلس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔

”ہم میں اور تم میں“ ایلین نے کہنا شروع کیا۔ ”یہ طے ہو چکا تھا۔۔۔۔۔۔“

”میں نے آپ کی پیشکش قبول کر کے غلطی کی ہے“ کوچوان نے کہا۔

”میں سمجھا نہ تھا مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔“

”یہ تم جھوٹ بک رہے ہو۔ تم نے سب کچھ سمجھ کر ہی ہماری پیشکش قبول کی

تھی۔“

”براہ کرم آپ یہاں اتر جایئے۔ آپ سب اتر جایئے۔ میں یہاں سے آگے نہ

جاؤں گا۔“

”الو کے ٹپھے، ٹالاقی، کیئے۔“

چارلس برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنا گھونسہ بلند کیا۔ کوچوان نے چابک چلا دیا۔ اور وہ چارلس کے بائیں کان کے سڑا کے کی آواز پیدا کرتا ہوا جھک گیا ایلین گاڑی کے دوسری طرف کھڑا ہوا تھا وہ جلدی سے آگے بڑھا۔ اور گھوڑوں کے سروں کے سامنے سے گزرتا ہوا چارلس کے قریب آکھڑا ہوا۔ وہ اپنے بھائی کی مدد کو آیا تھا لیکن اس کی نگاہیں جیسے اتفاقاً چارلس کی پشت کی طرف اٹھ گئیں وہ حیرت سے ہنسی ہوئی آنکھوں سے چارلس کے پیچھے دیکھنے لگا۔

”ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ دیکھو۔“ ایلین نے دہلی ہوئی آواز میں کہا۔

کوچوان کی گردن بے اختیار اس طرف گھوم گئی۔ جس طرف ایلین نے اشارہ کیا تھا وہ کانپ گیا۔ اور جیسے ہی جبرا اپنی گردن دوسری طرف گھما کر اس چیز پر نگاہیں ہٹانے میں کامیاب ہو گیا کوچوان اس کتے کی طرح کانپ رہا تھا جو سرد اندھیری اور طوفانی رات میں کسی سرد تالاب میں سے گر کر نکلا ہو۔

چارلس نے ایلین کی اٹھی ہوئی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔

”قصر!“ اس نے حیرت سے کہا۔

سرخی دھندلے اور برف پوش پہاڑوں کے پس منظر میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہوا وہ قدیم اور عظیم الشان قصر کسی بھی سیاح کو اپنی طرف کھینچ سکتا تھا۔ قصر کے چاروں طرف دندنے دار اور اونچی پہاڑیاں تھیں جو شام کے اندھیرے میں دھندلی نظر آ رہی تھیں لیکن قصر کی بلند اور سنگین فصیل اور اس کے برج نظر آتے تھے فصیل اور برج بھی جگہ جگہ سے سیاہ ہو رہے تھے یہ غالباً کالی تھی جو قصر کی قدامت کا پتہ دیتی تھی۔

چارلس نے کوجوان کی ایک ٹانگ کو جھنجھوڑ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”کوئی جگہ ہے وہ اس نے پوچھا؟“

”کوئی جگہ؟“ کوجوان نے انجیل بن کر پوچھا۔

”وہ قعر! تم کئی دفعہ اس کے قریب سے گزرے ہو گے اور چونکہ اس علاقہ سے واقف ہو اس لئے اس قعر کا نام جانتے ہو گے کیا نام ہے اس کا۔؟“

”کونسا قعر؟“ کوجوان نے گویا آنکھیں بند کر کے پوچھا۔

”وہ کیا ہے اس پہاڑی کی چوٹی پر۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔“

”میں کوئی قعر نہیں دیکھ رہا۔“ کوجوان نے کہا۔

اور یہ اس نے غلط نہ کہا تھا۔ یقیناً وہ کوئی قعر نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ قصداً مخالف سمت دیکھ رہا تھا کوجوان اپنی جگہ پر بیٹھا ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

چارلس اب برداشت نہ کر سکتا تھا اس نے دوسرا ہاتھ بھی برسا کر کوجوان کی ٹانگ پکڑ لی کہ اسے گاڑی پر سے گھسیٹ کر نیچے ڈال دے۔ کوجوان نے بڑی کینگی کا ثبوت دیتے ہوئے چارلس پر چابک چلا دیا۔ چابک کی رسی گنگنا اٹھی بے اختیار چارلس کے منہ سے ایک گالی نکل گئی اور اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ کوجوان کو نیچے گھسیٹ لیا اور اب وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے دھول میں لوٹ رہے تھے۔

چارلس کوجوان کی گرفت سے آزاد ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ایلن دوڑ کر چارلس کے قریب آیا۔ اب وہ دو تھے اور کوجوان اکیلا تھا چنانچہ یقین تھا کہ وہ دونوں مل کر اسے زیر کر لیں گے۔ لیکن کوجوان جب اٹھ کھڑا ہوا تو اس کے دائیں ہاتھ میں ایک خطرناک چاقو تھا جو استرے کی طرح تیز تھا اور یہ بڑا سا پھل سورج کی آخری کرنوں میں اور آخری دھمکی آیزناہد میں چمک رہا تھا۔

ایلن کے پیر تو جیسے زمین میں گڑ گئے چنانچہ وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ البتہ

چارلس آگے بڑھا اور کوجوان نے چاقو جھونکنے کے سے انداز میں اپنا ہاتھ اس کی طرف ایک جھٹکے سے برسا دیا۔

”بس بہت ہو چکا۔“ کوجوان نے کہا۔ ”اپنی عورتوں کو گاڑی میں سے اتار لو۔“

چارلس اور ایلن بت بہتے کھڑے رہے۔

”اتار لو۔“ کوجوان نے کڑک کر کہا۔

کوجوان کی آواز میں جو کڑک اور دھمکی تھی اس نے چارلس کو یقین دلادیا کہ اب بحث کرنا فضول تھا یہ نہ تو صحیح یا غلط کا سوال تھا نہ اخلاق اور بد اخلاق کا اور نہ ہی تہذیب اور بد تہذیب کا۔ کوجوان بد تمیز ہوا یا باتمیز بد اخلاق ہوا یا خوش اخلاق بہر حال اس وقت اس کے سر پر بموت سوار تھا وہ لوگ ایک اجنبی ملک کے غیر آباد اور ویران علاقے میں تھے کوجوان خوف اور غصے سے پاگل ہو رہا تھا چنانچہ خیمہ بیت اسی میں نظر آتی تھی کہ اس سے بحث کرنے یا اخلاق و شانسی کا سبق پڑھانے کے بجائے اس کے اس نادری حکم کی تعمیل کی جائے۔

چارلس کے ان خیالات کو ایلن نے زبان دی، ڈانکا اور ہیلن گاڑی کی کھڑکیوں میں سے خوفزدہ اور پریشان نظروں سے باہر جھانک رہی تھی ایلن نے ان کی طرف ہاتھ ہلا کر کہا۔

”اتر آؤ۔“

”جی! ہیلن نے تھوک نکل کر کہا۔

”ارے بھی سنا نہیں کوجوان صاحب کا حکم؟ نیچے اتر آؤ۔“

دونوں عورتیں گاڑی میں سے اتر آئیں۔ ان کے نازک بوجھ تلے گاڑی کا پائیدان چرچا کر رہ گیا۔ دفعتاً کوچ گاڑی میں جھٹے ہوئے گھوڑوں میں کا گھوڑا ہنسنے اور زمین پر ٹاپ مارنے لگا، وہ کسی وجہ سے خوفزدہ معلوم ہوتا تھا اور ایسا لگتا

آپ موجود ہوئے۔“

اور اس سے پہلے کہ وہ اسے سمجھاتے، اس سے کوئی معاملہ طے کرتے کوچوان نے چابک بجا کر گھوڑوں کو اشارہ دیا۔ گھوڑے پہنکار کر اور ہنسنا کر پیچھے ہٹے، گاڑی کے پئے چڑھائے اور وہ اسی طرف گھوم گئی جس طرف سے وہ لوگ اس میں سوار ہو کر آئے تھے۔

کوچوان نے سر اٹھا کر اندھیرے آسمان کی طرف اور پھر چاروں طرف دیکھا، اس کے شرے سے انتہائی خوف عیاں تھا، اس نے اندھیرے میں جنگل کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے خوف تھا کہ درختوں کے مہیب سایوں میں سے ان دیکھی بلائیں نکل آئیں گی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور پانگلوں کی طرح گھوڑوں پر چابک برسا دیئے۔ اور وہ خالی گاڑی کو لے کر حیرت انگیز تیزی سے بھاگ پڑے۔ اور وہ چاروں اس چوراہے پر کھڑے گاڑی کو اندھیرے میں غائب ہوتے دیکھتے رہے۔

”وہ ٹھک تو نہ تھا۔“ چارلس نے کہا۔

”ہاں۔ نہ تھا“ ایلین بولا۔

”لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارا سامان ہمارے پاس ہی رہ گیا اور یہ بھی غیبت ہے ورنہ کہاں ٹنگے بوچے مارے مارے پھرتے۔“

ہیلن کے مقابلے میں ڈانکا کی عقل کچھ زیادہ منجھی ہوئی تھی اور بعض دفعہ وہ بالکل منطقی اور صحیح سوال پوچھ جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے پوچھا۔

”مگر وہ کل آکر ہمیں لے جانے کے لئے تیار ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آج ایسی بدحواسی سے کیوں بھاگ گیا؟ اگر وہ کل صبح سورج طلوع ہونے کے بعد یہاں آسکا اور ہمیں لے جاسکتا ہے تو پھر۔۔۔۔۔“

تھاجیس وہ جلد از جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔

کوچوان کی طرح چارلس بھی کانپ رہا تھا، لیکن کوچوان کی کپکپی شاید خوف کی تھی اور چارلس کی حد سے بڑھے ہوئے غم کی۔

”اس کی ایسی کی تھی۔“ چارلس نے دانت پیس کر کہا۔

چارلس دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر کوچوان کی طرف بڑھا۔

موخر الذکر نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا تو ڈانکا نے اپنے شوہر کا بازو تھام لیا۔

”جانے دو چارلس۔“ ایلین نے بڑے خشک لہجہ میں کہا۔ ”یہ شخص ٹھک ہے

چنانچہ ہمارا سامان لے جانا چاہتا ہے۔“

کوچوان ایک لمحے تک جہاں تھا وہیں کھڑا رہا، اور پھر گاڑی پر جا چڑھا گاڑی کی چھت پر ان چاروں کا سامان ایک رے بندھا رکھا ہوا تھا کوچوان کے چاقو کا پھل پھر چکا اور ”کٹ“ سے رسہ کٹ گیا جس سے سامان بندھا ہوا تھا۔ ایک چوکور بکس کچھ دیر تک چھت کے کنارے پر جھولا رہا اور پھر بڑی آواز کے ساتھ نیچے گرا۔ دوسرے بکس آسانی سے نیچے پھسل آئے۔ دو بکس گاڑی کے ایک طرف اور تین دوسری طرف گرے۔

ڈانکا اور ہیلن گرتے بکسوں سے بچنے کے لئے جلدی سے کئی قدم پیچھے ہٹ گئیں، چارلس نے ڈانکا کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا اور آگے بڑھ کر اس چھوٹے بکس کو پکڑ لیا جو ایک طرف لٹکا جا رہا تھا۔

کوچوان نے اپنی جگہ بیٹھ کر لگائیں تھام لیں۔

”کل میں واپس آجاؤں گا۔ سورج طلوع ہو جانے کے بعد میں اسی جگہ آپ لوگوں کا انتظار کروں گا۔ اور اگر آپ لوگوں میں سے کوئی یہاں موجود ہوا تو اسے گاڑی میں بٹھا کر لے جاؤں گا۔ لیکن جوزف باد نہیں بلکہ واپس لے جاؤں گا۔ ہاں اگر



چارلس اور جیلن کان لگا کر سننے لگے۔ ڈانٹا نے غلط نہ کہا تھا۔ کہیں دور سے بہت دور سے آوازیں آرہی تھیں..... بجزیوں کے چلانے کی آوازیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بجزیوں کا پورا غول کہیں بیٹھا ایک آواز ہو کر چلا رہا تھا۔ یہ آوازیں بہت مدہم تھیں لیکن اس دیرانے کی خاموشی میں بڑی ہی بھیاک اور لرزہ خیز معلوم ہوتی

”کوچوان نے قصر کے وجود سے کیوں انکار کر دیا۔؟“
”ہیں!“

”یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا لیکن کیا وجہ تھی کہ اس نے قصر کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ہمارے بار بار توجہ دلانے کے باوجود اس نے قصر کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا۔“
اور اب ان تینوں نے گردنیں گھما کر قصر کی دیکھا۔ وہ لوگ اب بھیڑیوں کو بھول چکے تھے۔

خدا جانے کیوں چارلس نے یقین کر لیا تھا کہ وہ قصر کھنڈر ہوگا۔ اس کے برج اور یہ فیصل غالباً یہاں سے سالم اور مضبوط نظر آتی ہوگی لیکن یہ برج اور یہ فیصل دراصل ایک خول ہوگا اور اس خول میں کچھ نہ ہوگا سوائے ٹوٹی ہوئی عمارت کی بے چہت اور تنگی دیواروں اور ٹوٹے پھوٹے ننگے ستونوں کے لیکن اب جو اس نے قصر کی طرف دیکھا۔ تو چونکا اور اسے اپنا پچھلا خیال بدلنا پڑا۔ قصر کی تین کھڑکیاں نہ صرف کھلی تھیں بلکہ روشن تھیں۔ ان کھڑکیوں کے پیچھے جو کمرے تھے یا جو کچھ بھی تھا ان میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ روشنی بہت دور ٹٹماتے ہوئے تین چھوٹے ستاروں کی طرح معلوم ہوتی تھی لیکن بے شک و شبہ وہ روشنی ہی تھی۔

”قادر شینڈور نے غلط نہ کہا تھا“ چارلس بولا ”قصر موجود ہے اور ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ ہاں اگر یہ نظر کا دھوکا ہو تو بات دوسری ہے۔ لیکن یہ نظر کا دھوکا ہوتا تو قصر ہم چاروں میں سے، بلکہ پانچ میں سے کیونکہ کوچوان بھی اس کے وجود سے واقف تھا، کسی ایک کو نظر آتا۔ لیکن چونکہ اس وقت ہم چاروں اسے بیک وقت دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے قصر ایک حقیقت ہے۔“

”لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر شخص اس کے وجود سے منکر کیوں ہے؟“
ایلن نے کہا ”کمال تو یہ ہے کہ نقشے میں بھی اس کی نشان دہی نہیں کی گئی۔ یہ بات

جس جگہ کوچوان نے انہیں اتارا تھا۔ وہاں سے قصر اندھیرے کے سوا اپنی پوری ہیبت کے ساتھ کھڑا آہنی سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔ یہ وہی قصر تھا۔ جو نقشے میں کہیں نہیں تھا۔ اس کے وجود کا کوئی نشان نہ تھا۔ ماسوائے فادر کے سب ہی اس کے منکر تھے۔ کوچوان نے خوف بھری نظروں سے اس قصر کو دیکھا تھا۔ کوچوان کی توجہ دلانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بالکل انجان بن گیا۔ جیسے کہ اس قصر کی طرف دیکھنا تو ایک طرف اس کی طرف رخ کرنا بھی گناہ ہو۔ اس سے اس قصر کے بارے میں معلوم کرنا بالکل بے سود تھا۔ وہ تو اس قصر کی طرف دیکھنا بھی نہ چاہتا تھا۔

ایلن ان سے چند فٹ دور کھڑا ان کے پیچھے کسی چیز کو دیکھنے میں محو تھا۔ چارلس ڈانکا اور ہیلن قصر کو ایک نظر دیکھ کر اسے گویا بھول ہی گئے تھے لیکن اس قصر نے ایلن کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ اس وقت بھی اس پہاڑی پر کھڑے ہوئے عظیم الشان قصر کی طرف ایک عالم بے خودی میں دیکھ رہا تھا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ ایلن نے کہا۔
”کیا؟“ چارلس نے کہا۔

ایلن نے بھی کچھ کہے بغیر کندھے جھٹک دیئے۔
”میرے خدا! وہ کیا ہے؟“ ڈانٹا نے کہا۔

اور ان سب نے اس طرف دیکھا جس طرف ڈانٹا اشارہ کر رہی تھی، اندھیرے جنگل میں کچھ تھا، ایک نیلے رنگ کا ننھا سا شعلہ جو الف کی طرح سیدھا کھڑا تھا۔
”واقعی یہ کیا چیز ہو سکتی ہے“ چارلس نے کہا، شاید کسی جموہپڑی میں دیا جل رہا ہے۔“

”لیکن یہاں کوئی جموہپڑی نہ تھی۔“ ہیلن بولی۔ ”اور پھر اگر جموہپڑی میں دیا جل رہا ہوتا۔ تو دو باتیں ہوتیں۔ اول تو شعلہ سرخ ہوتا۔ اور پھر وہ زمین سے کافی اونچا ہوتا۔ لیکن یہ شعلہ نیلا ہے۔ اور جیسے زمین سے لگا ہوا ہے۔“
”تمیں دیکھتا ہوں جا کر یہ کیا بلا ہے۔“ چارلس نے ایک قدم بڑھایا۔

”نہ جاؤ۔ خدا کے لئے نہ جاؤ۔“ ڈانٹا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ”اور پھر بھیڑیے بھی شاید قریب آگئے ہیں۔“ ہیلن نے کانپ کر کہا۔

چارلس اور ہیلن بھیڑیوں کو واقعی بھول گئے تھے اب جو وہ اس طرف متوجہ ہوئے، تو ان کے چلانے کی آوازیں قریب سے، بہت ہی قریب سے سنائی دیں، صرف یہی نہیں بلکہ نیلے شعلے کے آس پاس چند سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔
”بھیڑیے!“ ڈانٹا نے تقریباً چیخ کر کہا۔

”یہ شاید بھیڑیے نہیں ہیں۔ یہ تو کچھ غیر مادی چیزیں معلوم ہوتی ہیں“ چارلس نے کہا۔

”غیر مادی چیزیں کیا ہوتی ہیں؟“

”میں ان میں یقین نہیں رکھتا ورنہ کہہ دیتا کہ یہ بھوت پریت ہیں۔“ چارلس نے ہنس کر کہا۔ بہر حال ڈرو نہیں۔ اندھیرے، جنگل تنہائی اور ایسی بھیانک رات میں

نہیں کہ قصر نیا ہو۔ خاصاً قدیم ہے چنانچہ نقشہ بنانے والے اس کے وجود سے متاوقف ہوں یہ بات بعید از قیاس ہے۔“

”فادر شینڈور نے کہا تھا کہ ہم قصر کے قریب بھولے سے بھی نہ جائیں“ ڈانٹا نے کہا۔

”اور میں فادر شینڈور سے متفق ہوں“ ہیلن نے کہا ”اس قصر میں یقیناً کوئی خاص بات ہے۔ خواہ مخواہ میرا دل دھڑکنے لگا ہے اور مجھ پر عجیب ہیبت سی طاری ہونے لگی ہے۔ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔“

چارلس نے حیرت سے اپنی بھابی کی طرف دیکھا آج یہ اس نے عجیب بات کہی تھی کہ اس کے دل پر ہیبت طاری ہونے لگی تھی۔ وہ ہیلن کو جانتا تھا۔ اور اس کے مزاج سے واقف تھا۔ نسوانی کمزوری کا اظہار کر کے خوفزدہ ہونا، یا بے ہوش ہو جانا۔ اس کے اصول کے خلاف تھا کوچوان کے گستاخانہ سلوک کے بعد اسے محض آجانا چاہئے تھا۔ اور چارلس کو یقین تھا کہ ہیلن غصہ میں پیر پختی قصر کی طرف چل دے گی۔ ڈھلان چڑھ کر وہاں پہنچ جائے گی، اور دروازے پر دستک دے گی۔ بڑی شان سے ملکہ کی طرح اس میں داخل ہوگی اور قصر کے کینوں کو حکم دے گی کہ فوراً کسی کو سرائے کی طرف دوڑا دیا جائے۔ بلکہ خود بادشاہ فرانس جوزف کے پاس آدمی بھیج کر اس تالائق کوچوان کی شکایت کی جائے اور اسے سزا دلوائی جائے لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کے برخلاف وہ خوفزدہ تھی، اور فادر شینڈور کے اس مشورے سے متفق تھی کہ قصر کے قریب نہ جایا جائے۔

چارلس اپنے بھائی سے مشورہ کرنے لگا۔ کہ اب کیا کیا جائے، ایلن عمر میں بڑا ضرور تھا۔ لیکن ان لوگوں میں سے تھا۔ جن سے کبھی کوئی مشورہ کیا جاتا ہے۔ تو وہ شانے اچکا کر خاموش ہو رہتے اور اپنے آپ کو دوسروں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ چنانچہ

”اور پھر صبح۔۔۔۔۔“

دفعۃً اس کی آواز ڈوب گئی اور چارلس جھونپڑی کے دروازے میں سے نکل کر ڈانٹا کے قریب آکھڑا ہوا۔ اگر وہ بھوتوں پر یقین رکھتا تو یہ بھی یقین کر لیتا کہ یہ جنگل بھوتوں کا مسکن تھا۔ عجیب عجیب خلاف عقل باتیں ہو رہی تھیں یہاں۔

”بھینڑیوں کی آواز ایک دم سے بہت قریب آگئی تھی۔ جیسے وہ ان کے چاروں طرف پھیل گئے ہوں اور آہستہ آہستہ اپنا حلقہ تنگ کر رہے ہوں۔ اور جنگل میں اب ایک کے بجائے تین شعلے نظر آرہے تھے جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر الف کی طرف کھڑے تھے۔

اور اب وہ سب ایک اور آواز بھی سن رہے تھے دور سے آتی ہوئی مدھم آواز۔ یہ آواز کہیں سامنے سے اور جنگل میں سے آرہی تھی اور بڑی تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی، اور اب وہ چاروں بجھی کے گھوڑوں کے سازو سامان کی جھنکار، پیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز صاف سن رہے تھے بجھی یا کوچ گاڑی یا جو کچھ بھی وہ تھی سیدھی ان کی طرف آرہی تھی۔

”معلوم ہوتا ہے اس گستاخ کو جوان کو ہماری حالت پر رحم آگیا ہے۔“

ایلن نے کہا۔ ”اور وہ حضرت اپنا ارادہ بدل کر صبح کے بجائے اسی وقت لینے آگئے ہیں۔“

”تمہارا خیال شاید غلط نہیں ہے۔“ ہیلن نے کہا۔

اور وہ لوگ جھونپڑی کے قریب کھڑے دیران چوراہے کی طرف پر امید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن یہ آواز اس سمت سے نہ آرہی تھی۔ جس طرف کو جوان اپنی کوچ لے کر بھاگ گیا تھا۔ یکایک اور خلاف توقع ایک بجھی قہر والے ٹیلے کی ڈھلان پر آگ آئی ہو۔ جھاڑیوں اور پھر درختوں کے جھنڈ میں سے نکل آئی۔ وہ

اوٹ پٹانگ چیزیں نظر آیا ہی کرتی ہیں۔“

”بہر حال بھیڑیے تو غیر مادی، ظاہر ہے کہ نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمیں کسی جگہ پناہ لینا چاہئے۔“ ایلن نے کہا۔

اور چارلس نے لکڑہارے کی جھونپڑی کی طرف ہاتھ ہلا کر کہا۔

”ہم آگ جلا کر اس جھونپڑی میں قیام کر سکتے ہیں۔“

”یہاں کھلی جگہ سے تو وہ جھونپڑی بہتر ہے“ ہیلن نے کہا۔

چنانچہ چارلس اور ایلن نے بڑے اور وزنی بکس اٹھائے اور چھوٹے اور ہلکے بکس عورتوں کے لئے چھوڑ دیئے۔ وہ چاروں جھونپڑی کے قریب پہنچ گئے، دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اس کی چولیس ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ اور کواڑ دہلیز کے پتھر پر آرہے تھے، چارلس نے کواڑ کو اپنے کندھے سے دھکا دیا تو وہ ایک چراگ کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

جھونپڑی تنگی اور خالی تھی۔ ایک کونے میں لکڑیوں کا انبار تھا۔ یہ ایندھن تھا۔ اس کے قریب خشک پھونک شبنیاں احتیاط سے رکھی ہوئی تھیں۔

”رز ہوٹل کا سا تو آرام یہاں نہ ملے گا۔“ چارلس نے کہا ”لیکن پھر بھی غنیمت ہے۔“

ہیلن نے جھونپڑی کے دروازے میں کھڑے ہو کر ”سوں“ سے اندر کی ہوا سونگھی اس میں دھول اور قدامت کی بو تھی۔ بہر حال خود ہیلن نے کہا تھا کہ کھلی جگہ سے یہ جھونپڑی بہتر ہے۔ اور چارلس نے سوچا کہ قدرت کا یہ قرب اندھیرا، جنگل اور یہ بھیانک رات اس کی بھابی کا مزاج شاید بدل دے گی۔ اور خدا جانے کیوں اس نے ہیلن کی تکلیف کے خیال سے ہی اپنے دل میں مسرت کی لہری محسوس کی۔

”ہم جھونپڑی کے دروازے کے سامنے الاؤ جلا سکتے ہیں“ ڈانٹا کہہ رہی تھی

گھوڑے بگھی کو کھینچتے ہوئے حیرت انگیز اور خطرناک تیزی سے بدستور بھاگے
آ رہے تھے۔ جیسے ہر اس چیز کو کچل کر رکھ دیں گے جو ان کی راہ میں حائل ہوگی۔
”چارلس! ہٹ جاؤ راستہ سے۔“ ڈانکا چلائی۔

چارلس اپنی ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑا ہو گیا اب وہ تیار تھا کہ بگھی اور گھوڑے
قریب آئیں، تو وہ اچھل کر ایک طرف ہٹ جائے اور قریب سے گزرتی ہوئی بگھی کے
گھوڑوں کی لگائی پکڑ کر انہیں روک لے۔ لیکن اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔
چوراہے کے قریب پہنچ کر گھوڑوں نے دفعتاً اپنی رفتار کم کر دی اب وہ ہلکے
چل رہے تھے اور پھر چارلس کے عین سامنے لیکن ان سے کوئی چھ فٹ دور آکر رک
گئے دفعتاً ”جگل کی خاموشی اور بھی گہری ہو گئی۔ دونوں گھوڑے خاموش کھڑے ایک
دوسرے کی تھو تھنی چاٹ رہے تھے اور ایک دوسرے سے جیسے کچھ کہہ رہے تھے۔
”ہو۔ او۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔“ کہیں دور سے ٹکڑ بھگے کی قہقہہ نما چیخ سنائی دی اور اس
نے لمحہ بھر کے لئے خاموشی کی چادر میں شکاف ڈال دیا۔

چارلس آگے بڑھا۔

”ہو۔ ہو۔ ہی۔ آ۔ آ۔“ مردار خور لکڑی کا کسی پاگل شخص کی طرح چیخ پڑا
بھڑیے خاموش تھے، وہ کہیں غائب ہو گئے تھے۔

چارلس گھوڑوں کے سامنے جا کھڑا ہوا پہلے اس نے ایک گھوڑے کے اور پھر
دوسرے گھوڑے کے سر پر ہاتھ پھیرا وہ نہ بد کے اور نہ بہنائے اس نے لگائیں پکڑ لیں
گھوڑے اب بھی بے حرکت کھڑے رہے۔

ایلن آگے بڑھ کر اپنے بھائی کے قریب آ گیا۔

”بڑی حیرت انگیز بات ہے یہ تو“ وہ بولا۔

”چنانچہ اس حیرت انگیز بات سے یہ ثابت ہوا کہ معجزوں کا دور ابھی گزرا

خطرناک تیزی سے تنگ اور دیر ان سڑکوں کے اتصال کی طرف بھاگی آ رہی تھی۔
ایک کالے رنگ کی بگھی جسے دو بے حد عمدہ گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ اور ان
گھوڑوں کا رنگ بھی کالا تھا۔

اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس بگھی کو چلانے اور گھوڑوں کو ہانکنے والا کوئی نہ
تھا۔

بھڑیوں کی آوازیں یکایک خاموش ہو گئیں، نیلے شعلے دفعتاً جیسے ہلن زمین میں
اتر گئے۔

ڈانکا نے اپنے شوہر چارلس کا بازو پکڑ لیا۔ اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور
چارلس نے ان کے ناخنوں کو اپنی جلد میں اترتے محسوس کیا۔

ہیلن نے سرگوشی میں کچھ پوچھا۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا دریافت کر رہی
تھی۔ گھبراہٹ کی وجہ سے اس کے الفاظ اوپر تلے کر کر گمٹ گئے تھے۔

ایلن نے کہا ”اس بگھی کو ہم روک لیں۔؟“

”کوشش کرنی چاہئے۔“ چارلس نے کہا۔

اور وہ آگے بڑھ کر راستہ کے بیچ میں جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر
اٹھا دیئے۔

گھوڑے چارلس کی طرف بھاگے آ رہے تھے ان کی گردنیں تلی ہوئی تھیں سر
پیچھے کو ڈھلکے ہوئے تھے۔ اور ان کی لگائی ہوا میں باریک دھاگوں کی طرح اڑا اور لہرا
رہی تھیں۔ جگل کے اندھیرے مہیب سایوں میں ان گھوڑوں کے کالے جسم جیسے خود
اپنی آگ میں جل رہے تھے ان کی سیاہ جلد سے ایک عجیب طرح کی مدہم روشنی پھوٹی
مطلوم ہوتی تھی۔ ایک طرح کی دوزخی روشنی، بڑی غیر ارادی چمک تھی یہ۔

”چارلس۔۔۔“ ڈانکا چیخی۔

پھر یہ دونوں عورتیں اس بگھی کی اسرار پر اسراریت کو معاف کر دینے کے لئے تیار تھیں، لیکن یہ تو بعد کی باتیں تھیں فی الحال سوال یہ تھا کہ اس بگھی میں سوار ہوئے۔ مناسب ہو گا یا نہیں۔ جو اپنے آپ ہی اور وہ بھی اس قصر کی طرف سے چلی آئی تھی۔ جس کے قریب تک جانے سے قادر شینڈور نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ دونوں کوئی فیصلہ نہ کر سکیں تو خود چارلس نے انہیں مجبور کر دیا۔

”ہم سامان چڑھائے دیتے ہیں۔ بھائی! آپ ذرا گھوڑوں کو تھامے رہیں۔“ اس نے کہا۔

یہ بڑا فوری حکم تھا۔ اور ہیلن آگے بڑھنے کی بجائے کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ چارلس نے ڈانکا کی طرف دیکھا۔ اور اس بات پر دل ہی دل میں فخر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ کہ ڈانکا بڑی دلیری سے آگے بڑھی اور بڑی بے خوفی سے گھوڑوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

سامان لاوا جا چکا۔ اندھیرا اور بھی گہرا ہو گیا تھا اور آسمان سیاہ روشنائی کے رنگ کا ہو رہا تھا۔ اور وہ ویران تھا۔ کہیں ایک ننھا سا ستارہ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ چنانچہ ان کو بڑے احتیاط سے اور دھیمی رفتار سفر کرنا تھا۔

چارلس کو جوان کی نشست پر بیٹھ گیا اور اس نے لگائیں تھام لیں ایلن نے سارا دے کر پہلے ڈانکا کو اور پھر ہیلن کو بگھی میں سوار کرایا۔ ہیلن کانپ رہی تھی اور اس کا جسم سرد ہو رہا تھا۔ اور پھر ایلن نے چارلس کی طرف دیکھا۔

”جوزف باد؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ جوزف باد۔“ چارلس نے بڑے یقین سے جواب دیا۔

”قی۔ آ۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔“ لکڑکجے نے کہیں دور سے ایک قہقہہ لگایا۔

جوزف باد، زیادہ دور نہ ہو گا۔۔۔۔۔ چارلس نے سوچا۔۔۔۔۔ اب سے کچھ ہی دیر بعد

نہیں۔“ چارلس نے کہا۔

”لیکن یہ بے کو جوان کی بگھی اور یہ گھوڑے۔۔۔۔۔“

”بھائی صاحب!“ چارلس مسکرایا۔ ”جو گھوڑے انعام کے طور پر مل جائیں، پھر ان کی نسل دیکھنا فضول ہے اور اس وقت تو عجیب یا غریب یا غیر عجیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب یہ گھوڑے اتفاقاً ایک بگھی بھی کھینچ رہے ہوں۔“

ڈانکا اور ہیلن سڑک کے کنارے ایک خوفناک اور بے چینی کے عالم میں کھڑی ہوئی تھیں۔

”چارلس! ایلن! نہیں۔“ ہیلن نے کہا۔ ”میرے دل میں ہول اٹھ رہا ہے۔“

”کیوں! ہول کیوں اٹھ رہا ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔

”یہ۔۔۔۔۔ سب کچھ بے حد پر سرار ہے۔“ ہیلن نے کہا۔۔۔۔۔ ”سراسر غیر قدرتی ہے اور پھر۔۔۔۔۔ وہ بھیڑیے ایک دم سے کیوں خاموش ہو گئے۔؟ جیسے۔۔۔۔۔ وہ کچھ جانتے ہوں۔“

اس سے تو چارلس کو بھی انکار نہ تھا کہ بے کو جوان کی بگھی کی آخر واقعی ایک ناقابل فہم اتفاق تھا۔ لیکن وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو ایسی بعید از فہم باتوں پر غور کرتے ہیں۔ اس کے خیال میں تو ایسے سفر میں اگر ایسے عجیب و غریب واقعات نہ ہوں۔ تو پھر سفر کا لطف ہی کیا؟

”تو پھر سوار ہو جائیں بھی؟“ چارلس نے پوچھا۔

ہیلن اور ڈانکا آپس میں اور نیچی آواز میں کچھ مشورہ کرنے لگیں۔ وہ دونوں اس پر اسرار بگھی میں سوار ہونے سے ہچکچا رہی تھیں۔ تاہم پادی النظر میں بگھی بے حد محفوظ آرام دہ اور عمدہ معلوم ہوتی تھی۔ اور گھوڑے بھی کوئل، سدھ ہو گئے۔ گھڑے اور تیز رفتار تھے۔ اور اگر وہ انہیں لے جا کر کسی بہتی کی سرائے میں پہنچا سکتے تھے تو

وہ لوگ وہاں کی کسی عمدہ سرائے کے گرم کمرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہوں گے اور اس پر اسرار واقعہ اور اتفاق پر قہقہے لگا رہے ہوں گے اور وطن پہنچنے کے بعد جب اپنے دوستوں کو اس بے کوچان کی پر اسرار بکھی کا واقعہ سنائیں گے تو وہ بھی مارے حیرت کے دانتوں میں انگلی دے لیں گے۔

جب سے وہ لوگ بکھی میں سوار ہوئے تھے تقریباً اسی وقت سے بھیرلوں کی آواز رفتہ رفتہ ابھرنے لگی تھی وہ پھر چلانے لگے تھے اور جنگل کے اندھیرے قلب میں ہم وی نلا شعلہ نظر آ رہا تھا۔

”کسی کی مدد ہوگی“ چارلس نے اس کی طرف اشارہ کر کے اور ہنس کر کہا۔
”تو اب چلو۔“ ایلن نے کہا۔

”ج۔ج۔“ چارلس نے فصاحت کے گھوڑوں کو لگام سے دو طرفہ جھاڑ دیا اور اسی وقت اس نے سوچا کہ خدا جانے گھوڑے ایک اجنبی کے حکم کی تعمیل کریں گے یا نہیں۔

گھوڑوں نے خاموشی اور فرماں برداری سے چند قدم آگے بڑھائے ان کا سرخ اس سڑک کی طرف تھا جو جوزف باد جاتی تھی لیکن اس سڑک پر چلنے کے بجائے گھوڑوں نے یکایک اپنا سرخ بدلا اور بکھی زاویہ قائم بناتی دو سری طرف گھومنے لگی۔
چارلس نے چونک کر لگائیں کھینچ لیں۔

”ج۔ج۔ وہ۔ وہ۔ ج۔ج۔ اس طرف۔ اس طرف۔“ وہ گھوڑوں کو پکارنے لگا۔
لیکن نہیں، گھوڑے جیسے اس کا نہیں کسی اور کا حکم سن رہے تھے اور اب قہقہے تک جانے والا اندھیرا اور تقریباً نظر نہ آنے والا تھا، بکھی کے پیروں تلے تھا بکھی اسی راستہ پر چل پڑی۔ بکھی کو کھینچتے ہوئے گھوڑے سبک رفتاری سے وہ پہاڑی ڈھلان چڑھنے لگے۔ جو چوڑا ہے سے چند گز کے فاصلے سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ چارلس

طرف اندھیرا تھا البتہ سامنے اور پہاڑی کی چوٹی پر قصر کی کھلی ہوئی کھڑکیوں کی روشنی نظر آ رہی تھی اور بس۔

چارلس نے پوری قوت سے لگائیں کھینچ لیں لیکن گھوڑوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا، ان کی گردنیں بدستور تھیں رہیں اور وہ بدستور اس پر اسرار قصر کی طرف بڑھتے رہے جہاں سے وہ آئے تھے یا شاید بھیجے گئے تھے۔

گھوڑوں کو روکنے کی کوشش کرنا فضول تھا۔ چنانچہ چارلس نے انہیں روکنے کی کوشش ترک کر کے لگائیں ڈھیلی چھوڑ دیں رفتار نہ کم ہوئی اور نہ زیادہ وہ مناسب رفتار سے ڈھلان پر چڑھتے رہے چنانچہ اب کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا سوائے اس کے کہ منور تحمل کو بڑے صبر و سکون سے قبول کر لیا جائے، بہت ممکن تھا کہ قصر کے کین بڑے صمان نواز اور شریف لوگ ثابت ہوں انہیں کھلائیں پلائیں اور کوچان کا بھی انتظام کر دیں جو انہیں جوزف باد تک پہنچا دے۔ چارلس نے سوچا۔۔۔ قصر کے مالک کے گھوڑے شاید بدک کر کسی وجہ سے خوفزدہ ہو کر بکھی لے کر بھاگ پڑے تھے اور چونکہ وہ لوگ گھوڑوں اور بکھی کو داپس قصر تک پہنچا رہے تھے اس لئے قصر اور بکھی کا مالک انہیں ان کے اس احسان کا صلہ ضرور دے گا۔

لیکن معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہ گھوڑے خود بھی جلد از جلد قصر تک پہنچ جانا چاہتے تھے، اس کے علاوہ وہ راستہ سے پوری طرح واقف تھے کیونکہ اندھیرے میں چارلس کو تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ لگائیں کے اشارے سے گھوڑوں کو اوپر اوپر موڑ سکتا تھا۔ چنانچہ گھوڑے خود ہی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے وہ راستہ میں پڑے ہوئے پتھروں اور درختوں سے بڑی مہارت سے بچ کر نکل رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی انجانی قوت ان کی راہبری کر رہی ہو۔

ج۔ج۔ بہت ہوا کے جھونکے چارلس کے چہرے کو ڈنسنے لگے۔ قصر برف کی سرحد کے

محسن میں شاید پتھر جڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ گھوڑوں کے کھروں کی آواز بڑے زور سے گونج رہی تھی، مختلف راستے محسن کے بیچ میں ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے مختلف سمتوں میں جا رہے تھے اور اندھیری محرابوں تلے جا کر غائب ہو گئے تھے۔

گھوڑوں نے ایک مختصر سا چکر کاٹا اور اب بھی کی رفتار دھیمی پڑ گئی اور دوسرے ہی لمحے وہ قصر کے دروازے کے سامنے رک چکی تھی یہ ایک بے حد قدیم طرز کا دروازہ تھا۔ دروازوں میں گل میخیں جڑی ہوئی تھیں جو کسی زمانے میں جڑی گئی ہوں گی اور اس زمانے میں چمکدار رہی ہو گئی لیکن اب وہ رنگ آلود تھیں اور اوپر سنگین محراب تھی قدیم اور مضبوط۔

وادئ میں روتے ہوئے بھیڑیے خاموش ہو گئے چیخا ہوا لکڑیہکا بھی خاموش ہو گیا۔

چاروں طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ غیر ارغی اور پرہیز چارلس نے برج کی چوٹی کی طرف دیکھا جس پر برف کی تہہ جی ہوئی تھی اور پھر ایلن کی طرف دیکھا جو بڑے غصے کے عالم میں بھی میں سے اتر رہا تھا۔

”کیا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ تم پر کیا بھوت سوار ہوا کہ ہمیں یہاں لے آئے؟“

”بھوت مجھ پر نہیں بلکہ ان گھوڑوں پر سوار ہوا ہے۔“ چارلس نے جواب دیا۔
”یعنی۔“

چارلس اپنی نشست پر سے اتر کر ایلن کے قریب آکھڑا ہوا۔

”یعنی یہ کہ گھوڑوں کو میں نے لاکھ روکنے اور دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی لیکن یہ کبھت بھی سمیت ہم کو یہاں لے آئے“ چارلس نے کہا۔ ”یہ آپ نے غلط نہیں کہا شاید ان لعنتی جانوروں پر بھوت ہی سوار ہے یا یہ بذات خود بھوت ہیں۔“

دوسری طرف تھا اور جیسے جیسے ان کی بھی آگے بڑھ رہی تھی پہاڑیوں کے اونچے نیچے خطوط زیادہ سے زیادہ واضح ہوتے جا رہے تھے۔ برف سے ڈھکی ہوئی ڈھلان رات کے اندھیرے میں کسی یرقان زدہ کے رخساروں کی طرح زردہ مائل سفید ہو رہی تھی ہوا میں بھاری تھی۔ چند میل دور نظر آتی ہوئی ایک پہاڑ کی چوٹی کالے افق کے سینہ پر ایک سفید اور چپٹا داغ معلوم ہوتی تھی، درختوں کے پتے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نیچے وادی میں بھیڑیے بڑی بھیاں آواز میں رو رہے تھے اور کہیں دور شاید جنگل کے قلب میں کوئی لکڑیہکا بھوک سے پیٹاب ہو کر چلا رہا تھا۔

بلندیوں پر سے اور ٹھیک قصر کی طرف سے ایک بڑی سی چمکدار تیزی سے ہوا میں بہتی ہوئی آئی۔ کچھ دیر تک بھی کے گھوڑوں کے عین سامنے فضا میں معلق رہی اور پھر چارلس کے سر سے ٹکراتی ہوئی کہیں پیچھے نکل گئی۔

بھی ایک موڑ پر مڑی تو قصر کی کالی مہیب فیصل جیسے ایک دم سے درختوں میں سے نکل گئی۔ یہ منظر لمحے بھر تک ایک بلند چٹان کی اوٹ میں رہا۔ لیکن پھر ان کی بھی قصر کی عظیم الشان بیرونی فیصل کی طرف بھاگی جاری تھی۔

گھوڑوں کی ٹاپیں اور بھی کے پئے چوبی تختوں پر بڑی لرزہ خیز آواز میں بج اٹھے چارلس نے دیکھا بھی ایک چوبی پل سے گزر رہی تھی یہ پل ایک کافی چوڑی خندق پر بنا ہوا تھا۔ چارلس کو خندق سے پانی پر جی ہوئی برف کی بھی ایک جھلک نظر آئی اس سے زیادہ کچھ اور نہ دیکھ سکا کیوں کہ ان کی بھی بیرونی فیصل کے زبردست پھاٹک میں داخل ہو چکی تھی۔

پھاٹک کی بلند محراب میں شاید چمکداریں بھرا کئے ہوئے تھیں، کیوں کہ وہاں سے عجیب طرح کی مدھم آوازیں آرہی تھیں اس سے پہلے کہ چارلس ان کی آوازوں کی نوعیت سمجھ سکا بھی پھاٹک میں سے گزر کر قصر کے وسیع و عریض محسن میں نکل آئی

”خواتین بھی تشریف لائیں۔“ وہ بولا۔

پہلے ہیلن اتر آئی۔ اس کے بشرے سے انتہائی خوف عیاں تھا، جسم جیسے یکھت کے سخت ہو گیا تھا اور وہ عجیب پتھرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ”مجھے مجھے یہ جگہ پسند نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

”اس لکڑہارے کی جھونپڑی سے تو بہتر ہی ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔؟“

”جب ہم یہاں آ رہے تھے تو بھیڑیے کیوں رو رہے تھے۔؟“

”ظاہر ہے کہ میں بھیڑیوں کی فطرت کا باہر نہیں ہوں۔“ چارلس نے کہا۔

”البتہ اتنی سی بات تو کوئی بھی عقل سلیم رکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ بھیڑیوں کو نے کی عادت ہی ہوتی ہے۔“

”لیکن وہ لکڑہارے؟“

”اے بھی چیخنے کی عادت ہے بھائی۔ آئیے۔“

”نہیں۔ چارلس نہیں“ ہیلن نے لرز کر کہا۔

”سمجھ میں نہیں آتا بھائی۔ کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے!“

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ بے حد بھیاںک مقام ہے۔“

”چنانچہ ہم کم سے کم یہی معلوم کر لیں کہ کس قدر بھیاںک ہے۔“

اور چارلس دروازے کی طرف بڑھا تو نیچے وادی میں بھیڑیے ایک بار پھر رو کر اموش ہو گئے اور بجلی میں جتے ہوئے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے نے اپنا سر اٹھایا، اس کے آرائشی سامان کی ہلکی سی جھنکار خاموشی میں گھڑی بھر کے لئے گونج گئی، اور پھر گھوڑے نے بوے زور سے پھنکار کر اپنا سر جھکالیا۔

”چارلس! اس وقت تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور۔۔۔“ ایلن نے کنا شروع کیا۔

”بھائی صاحب! اب تو خدا سے دعا کرو اور یہ امید رکھو کہ اس بجلی کا مالک ہم گھوڑوں کی طرح مہماں نواز ثابت ہوں۔“

ایلن نے مشکوک نظروں سے ویران صحن کی طرف دیکھا۔

”خدا جانے یہ کیا اسرار ہے! خود تمہارا کیا خیال ہے چارلس؟“ اس نے الجھ کر

پوچھا

”میرے خیال میں تو یہ گھوڑے قلعی گھوڑے نہیں ہیں۔“

”تو پھر کیا ہیں؟“

”گھوڑوں کے روپ میں خواجہ خضر ہیں جو بھٹکے ہوئے مسافروں کی مدد کرتے ہیں

انہیں راستہ دکھاتے اور شاید منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔“

”لیکن ہماری یہ منزل تو نہیں ہے۔“ ایلن نے کہا۔

اور اس نے اپنی نگاہیں قصر کے دروازے پر مرکوز کر دیں۔ اور چارلس کو یہ سمجھ

میں دیر نہ لگی کہ ایلن کیا سوچ رہا ہے ان کی آمد کی آوازوں سے صحن گونج اٹھا تھا

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز، بجلی کے پیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور پھر خود ان کی باتوں کا

آواز رات کی خاموشی میں دور دور تک سنی جاسکتی تھی، چنانچہ یہ واقعی عجیب بات تھی

کہ اب تک تو دروازہ کھلا تھا اور نہ کوئی باہر آیا تھا اگر انہیں خوش آمدید کہنے نہیں

دھکے دے کر انہیں بھگا دینے کے لئے ہی کسی کو تو باہر آنا چاہئے تھا۔

چارلس نے بوے سکون کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”آؤ۔ بھائی، کم از کم قصر والوں کو سلام ہی کر لیں۔“

اور پھر وہ بجلی کی طرف گھوم گیا۔

باب-۳

دروازے کے دوسری طرف ایک وسیع وعریض کمرہ تھا۔ جس کی چھت بلند تھی اور جس کے انتہائی سرے پر ایک برآمدہ تھا۔ کمرے کے فرش سے برآمدے تک ایک بے حد خوبصورت اور چمکدار زینہ چلا گیا تھا۔ کمرے کی وسعت میں یہ زینہ کچھ اکیلا اکیلا سا معلوم ہو رہا تھا۔

چارلس قدم بڑھا کر اور دہلیز پھلانگ کر کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے کے فرش میں موٹے اور مضبوط پتھر چڑے ہوئے تھے اور دیواریں بھی پتھر کی تھیں۔ وہ بھی ضرورت سے زیادہ موٹی اور مضبوط معلوم ہوتی تھیں کمرے کے ایک کونے میں چیمٹھڑوں کا انبار تھا۔ لیکن ان چیمٹھڑوں پر کڑھے ہوئے نقش و نگار کے آثار اس بات کا پتہ دیتے تھے کہ کبھی یہ نہایت عمدہ پردے رہے ہوتے جو کمرے کی دیواروں کی ستر پوشی کیا کرتے ہوتے۔ ایک دیوار کی آغوش میں بڑا سا آئینہ تھا جس میں خشک لکڑیاں دھڑا دھڑا سلگ رہی تھیں اندھیرے کے بعد اور باہر کی سردی محسوس کرنے کے بعد آئینہ میں اٹھتے ہوئے شعلوں کا منظر اور کمرے کی گرم فضا بڑی فرحت بخش تھی اور ان انگریز مسافروں کو گویا خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

”کوئی ہے؟“

چارلس کی آواز خالی کمرے میں گونج گئی۔ کوئی جواب نہ آیا۔

”ہم لوگ مسافر ہیں۔ کوئی صاحب ہیں یہاں؟“

اس کی آواز کمرے کی تنگی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی وہ انتظار کرنے لگا لیکن کوئی نہ آیا۔

تاہم صاف ظاہر تھا کہ اس قعر میں ضرور کوئی تھا کیونکہ آئینہ میں آگ یقیناً

ایک بار خاموشی طاری ہو گئی میب اور کھل ترین خاموشی۔

چارلس نے دروازہ کے قریب پہنچ کر اپنا ایک ہاتھ دستک دینے کے لئے اٹھایا۔ لیکن ابھی اس نے کواڑ چھوا بھی نہ تھا کہ وہ بڑی آہستگی اور بڑی خاموشی سے اندر کی طرف ایک آدھ انچ کھل گیا اور روشنی کی ایک موٹی سی لکیر باہر رینگ آئی۔

چارلس نے گردن گھما کر ایلن کی طرف دیکھا جو اس کے عین پیچھے اور صرف چہ قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ دروازہ میں سے نکلتی ہوئی روشنی میں ایلن کا ایک رخسار داغدار تھا۔

”کیا خیال ہے۔“ چارلس نے پوچھا

”میرے خیال میں کوئی حرج نہیں۔“ ایلن نے جواب دیا۔

چارلس نے کواڑ کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ آہستہ سے کھل گیا۔



کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے، لیکن وہ خاموش رہا کیونکہ ہیلن پہلے ہی سے خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اور وہ اس کے خوف اور گھبراہٹ میں مزید اضافہ کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس کا تو اسے بھی اعتراف تھا کہ بات واقعی عجیب تھی پہلے تو بے کوجوان کی کبھی بڑے پر اسرار طریقے سے آگئی۔ کبھی کے آتے ہی بھیڑیے چلانے اور لکڑی کا تیتھے لگانے لگا۔ پھر گھوڑے اس کے قابو میں نہ رہنے اور انہیں اس قصر کے دروازے پر لے آئے قصر میں شاید کوئی تھا نہیں حالانکہ چار آدمیوں کے لئے میز لگی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ بے حد عجیب اور پر اسرار تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا۔ تو چارلس اس قصر میں قدم نہ رکھتا۔ لیکن اس وقت صورت حال مختلف تھی۔ وہ قصر کے صحن کے کسی کونے میں یا کبھی میں بستر لگانے سے تو رہا۔ قسمت انہیں یہاں لے آئی تھی۔ چنانچہ یہ رات اسی قصر میں بسر کریں گے یا کم سے کم اس وقت واپس نہ جائیں گے جب تک کہ قصر کے مالک سے ملکر اپنا اطمینان نہیں کر لیتے۔

وہ بے ڈھڑک آگے بڑھ کر کمرے میں پہنچ گیا اس کے ساتھی بھی قدرے شش و پنج کے بعد اندر آگئے۔ وہ لوگ دروازہ سے کئی قدم آگے بڑھ چکے تھے کہ دفعتاً ایک آواز صاف طور سے سنائی دی گھوڑوں کے ٹاپوں اور کبھی کے پتھریلے صحن پر گھومتے ہوئی پیروں کی آواز کبھی کو گھوڑے کھینچنے لگے تھے۔

حیرت اور گھبراہٹ کی ایک چیخ کے ساتھ ایلن دروازے کی طرف گھوم گیا۔ دونوں عورتوں کو دائیں بائیں ڈھکیل کر وہ دروازے کی طرف دوڑا۔ اور دوسرے لمحے وہ دروازے میں سے نکل کر ایک بار پھر رات کے اندھیرے اور سرد ہوا کے جھکنوں میں کھڑا ہوا تھا۔

وہ پر اسرار کبھی جس پر ان کا کل سلمان لدا ہوا تھا مناسب رفتار سے بھاگتی ہوئی صحن عبور کر چکی تھی اور اب اس کے انتہائی سرے پر پہنچ کر ایک اندھیری محراب کے

تھوڑی دیر پہلے جلائی گئی تھی اور پھر اس میں ابھی ابھی چند تازہ ٹکڑے رکھے گئے تھے جو اب تک سگے نہ تھے۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا۔ لیکن چارلس نے اب جو کمرے کا جائزہ لیا تو اسے ایک اور حیرت انگیز بات نظر آئی، آئینان کے قریب اور ذرا ہٹ کر ایک میز لگی ہوئی تھی، اور اس پر صرف چار آدمیوں کے لئے جگہ رکھی گئی تھی۔ میز لگی ہوئی تھی، چار آدمیوں کے لئے کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں لیکن وہاں کوئی شخص نہ تھا، سوائے چارلس کے۔ پورا کمرہ خالی تھا۔ کہیں کسی جاندار کی موجودگی کے آثار تک نظر نہ آرہے تھے۔

”ہیلو۔ کوئی ہے؟“

ایک بار پھر اس کی آواز تنگی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔

”سمجھ میں نہیں آتا کیا بات ہے۔ شاید قہروالے سویرے ہی سو جانے کے عادی ہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔

اور اس نے گردن کھما کر پیچھے دیکھا، ہیلن اور ڈانٹا دبے پاؤں اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ اور اس کے دائیں بائیں کے کمرے میں جھانک رہی تھیں ایک طرف ایلن بھی کھڑا ہوا تھا۔

”اب یہ قصر ظاہر ہے کہ آسیب زدہ نہیں ہو سکتا اچھا خاصا ہے اور شریف انسانوں کے لئے ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”چارلس! ہم اندر نہ جائیں گے۔“ ہیلن نے آہستہ سے کہا۔

”بھائی! آپ کو میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ بھوتوں کا مسکن نہیں ہے۔“

”بھوتوں کا مسکن ہو یا“ انسانوں کا اس میں کوئی خاص بات ہے۔ ہم اندر نہ جائیں گے۔“ چارلس سے ہیلن نے التجائی۔

چارلس کا جی جاہل۔ کہ وہ کہہ دے کہ ہم اندر جائیں گے۔ اور ضرور جائیں گے

”عجیب بات ہے کہ یہاں ہماری آمد غیر متوقع نہیں ہے۔“
”کیا مطلب؟“

ڈانکا نے چار کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”یہاں ہم بن بلائے مہمان نہیں ہیں۔“

”یہ کیا کہو اس کردی ہو تم؟“ ایلن نے کہا۔

”پہلے تو کبھی جو کسی طرف مڑی ہی نہیں بلکہ سیدھی یہاں لے آئی اور اب یہ کھانے کی میز پر صرف چار کرسیوں کے لئے لٹکائی گئی ہے۔ اور ہم چار ہی ہیں۔ چنانچہ یہاں عمارا انتظار ہو رہا تھا۔“ ڈانکا کی آواز میں حیرت تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ تو میں نہیں جانتی لیکن میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔“

چارلس کو اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت تھی اور وہ اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کا دل خوش کیا کرتا تھا۔ لیکن آج یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس سے اتفاق کرنے کے لئے ذرا بھی تیار نہ تھا۔ بلکہ وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی دم میں چار بے حد بزرگ قسم کے نوگ اس چکر دار زینے پر نمودار ہوں گے اور زینہ اتر کر خاموشی سے کھانے کی میز پر بیٹھ جائیں گے تاہم وہ یہ بھی چاہتا تھا بلکہ اس کی دعا مانگ رہا تھا کہ وہ اپنا بچا کچا کھانا انہیں دے دیں۔ دھتتا” وہ شدید اور ناقابل برداشت بھوک محسوس کرنے لگا۔

اس نے اپنی نگاہیں چکر دار زینے پر گاڑ دیں جیسے وہ اپنی قوت ارادی سے یا سحر سے قصر کے کمینوں کو بلا لے گا جیسے وہ اپنے جسم پر اس کی نگاہوں کی عتابانہ چیمیں اور اپنے دل میں اس کے بلاؤں کی عتابانہ آواز سن کر برداشت نہ کر سکیں گے اور جس حال میں بیٹھے ہوں گے۔ اسی حال میں اٹھ کر ”بلیک“ ”بلیک“ کہتے چلے آئیں گے۔

”جلدی آجاؤ“ چارلس نے دل میں کہا ”تم جو کوئی بھی ہو جلدی آجاؤ تاکہ ہم

نیچے جا کر تاریکی میں غائب ہو رہی تھی۔

ہیلن کے منہ سے ایک ہلکی نکل گئی وہ یوں کانپ رہی تھی جیسے اسے جاڑا چڑھ آیا ہو۔

”میں جانتی تھی۔۔۔ میں جانتی تھی کہ کچھ ہو گا۔۔۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ہمیں یہاں نہ آنا چاہئے“ وہ بولی۔ ”اگر تم نے میری بات سن لی ہوتی چارلس اگر وہاں چوراہے پر تم نے میری بات مان لی ہوتی۔ تو اس وقت ہم اس مصیبت میں نہ پھنس گئے ہوتے۔“

”میری پیاری بھالی۔“ چارلس نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اگر میں نے آپ کی بات مان لی ہوتی۔ تو اس وقت ہم انگلستان میں ہوتے۔“

”بے شک۔ اور اس میں کیا برا ہوتا۔؟“

”برا تو کچھ نہ ہوتا۔ لیکن آپ خود ہی اپنی معلومات وسیع کرنا چاہتی تھیں۔“

”اگر تم اسے ایک عظیم سیاحت یا تعلیمی سفر یا غذا جانے کیا کچھ کہتے ہو تو۔“

”اگر یہ معرہ حل ہو گیا، اگر معلوم ہو گیا کہ یہ کیا اسرار ہے تو یقین کیجئے بھالی آپ کی معلومات میں نہ صرف اضافہ ہو گا۔ بلکہ یہ سفر بھی عمر بھر یاد رہیگا ایسے عجیب واقعات ہر ایک کے ساتھ نہیں ہوتے۔“

”یہ کیا فضول کی بحث کر رہے ہو تم دونوں“ ایلن نے کہا جو کمرے میں آ گیا تھا۔

چارلس اور ہیلن خاموش ہو گئے ان چاروں نے پہلے باہر دیکھا۔ اندھیرا اور سرد ہوا تھی۔۔۔ اوپھر آتش ان کی طرف دیکھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ اور سب سے پہلے ڈانکا نے حرکت کی وہ میز کی طرف بڑھی وہ اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اور میز کا جائزہ لینے کے بعد اور کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے خاموش ہو رہی۔

”کیا بات ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔

جو شاید دونه سے نکل کر آئی تھی۔ وہ کانپ گیا۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے سامنے نظر کی اور اس دفعہ اسے کچھ نظر آیا۔ گزرگاہ کے انتہائی سرے پر کچھ دو جلتی ہوئی آنکھیں۔ وہ آنکھیں فرش سے چند انچ بلند تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چارلس کی طرف بڑھیں۔ پھر وہ اس کی طرف بھاگ پڑیں اور اس سے پہلے کہ چارلس ایک طرف ہٹ سکتا ایک غیر معمولی طور پر بڑا بلا اس کی ٹانگوں سے ٹکراتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

”اف! توبہ ہے“ اس نے اپنے خوف پر مسکرا کر ماتھے پر ہاتھ پھیرا تو وہ ٹھنڈے پینے سے غم ہو رہا تھا۔ یہ کیا حافقت ہے یار“

وہ آگے بڑھا اور اس دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا جو گزرگاہ میں پہلا دروازہ تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دستے پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمایا۔ دروازہ مقل نہ تھا۔ دستہ گھوم گیا۔ چارلس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔

یہ ایک آرام دہ کمرہ تھا، چھت سے ٹکٹا ہوا فانوس جل رہا تھا۔ آتشان میں آگ جل رہی تھی، ایک طرف مسری تھی۔ جس پر بستر لگا ہوا تھا اور آتشان کے سائے کمرے کی دیواروں پر ناچ رہے تھے۔ کسی کاشب خوابی کا لباس تنہ کیا ہوا مسری پر رکھا ہوا تھا۔

چارلس اٹنے قدموں واپس لوٹ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر مسری کے ایک طرف رکھے ہوئے سوٹ کیسوں پر پڑی وہ چونکا۔ لیکن پر دل ہی دل میں بولا کہ یہ اس کا وہم تھا۔ یا پھر آتش دان میں جلتی ہوئی آگ اس کی نظر کو دھوکا دے رہی تھی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو بروک نہ سکا اور کمرے میں داخل ہو کر سوٹ کیسوں پر جھک گیا۔

تمہارے قعر میں کس آنے کی معافی طلب کر لیں۔ پھر چند رسمی باتیں ہو جائیں تعارف ہو جائے اور پھر ہم سب میز پر بیٹھ کر پیٹ کی آگ بجھالیں۔ آجاؤ۔ جلدی آجاؤ۔“

اور وہ اپنے دل کی اس آواز پر آپ ہی آپ مسکرا اٹھا۔
”اول تو اس قعر میں کوئی ہے نہیں۔۔۔۔۔“ ڈانٹا نے کہنا شروع کیا۔
”نہیں کیسے ہے؟ یہ آتشان میں جلتی ہوئی آگ اور یہ میز اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قعر غیر آباد نہیں ہے“ چارلس نے کہا۔

”اور اگر ہے“ ڈانٹا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو اس سے اس مہیب اور اعصاب پر سوار ہو جانے والی خاموشی کے لئے قطعی تیار نہ تھا جو اس کی اس پکار کا جواب تھی۔

گزرگاہ بدستور خاموش رہی، دروازے بدستور بند رہے۔ کسی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی نہ دی۔ قعر خاموش تھا۔ قبر کی طرح خاموش تھا اور اب یہ خاموشی اسے بے چین کرنے لگی تھی۔ اگر نیچے کمرے کے آتشان میں آگ نہ جل رہی ہوتی اور اگر یہاں اس کی گزرگاہ میں شعلیں روشن نہ ہوتیں تو وہ یقین کر لیتا کہ یہ قعر عرصہ سے غیر آباد پڑا ہے، لیکن ایسی تو بات نہ تھی۔ قعر یقیناً غیر آباد نہ تھا پھر کیا وجہ تھی کہ یہاں کوئی نظر نہ آ رہا تھا؟ کیا وجہ تھی کہ اس کی پکار کا جواب نہ مل رہا تھا؟

ایک انجانا مگر موہوم سا خوف اس کے دل میں گھر کر کے لگا لیکن وہ واپس نیچے جا کر اپنے ساتھیوں کو یہ بھی بتانے کے لئے تیار نہ تھا کہ وہ بے نیل و مرام واپس آیا ہے۔

چند ثانیوں تک وہ خاموش کھڑا سوچتا رہا اور دفعتاً ”یوں محسوس ہوا جیسے اس گزرگاہ میں وہ اکیلا نہ تھا بلکہ کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا۔ کوئی غیر ارضی چیز کوئی روح

ہٹ گئیں۔

”آپ کا ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔

ایلن کی زبان گنگ ہو گئی تھی چنانچہ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

چارلس کو گزرگاہ کے دوسرے دروازوں کا خیال آیا۔ وہ پلٹ کر کمرے سے نکل آیا۔ اس سے پہلے کمرے سے چند قدم آگے دوسرا دروازہ تھا۔ اس نے اس دروازہ کا دستہ گھمایا۔ پہلے دروازے کی طرح یہ بھی مقفل نہ تھا۔ چنانچہ یہ بھی کھل گیا۔ اس کمرے کے آئینہ خان میں بھی آگ جل رہی تھی۔ اس کمرے میں بھی مسری تھی جس پر بسترا لگا ہوا تھا۔ اور اس مسری کے قریب بھی سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔



اب کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ اس سوٹ کیس سے جو سب سے اوپر رکھا ہوا تھا۔ وہ واقف تھا۔ یہ وہی سوٹ کیس تھا جسے وہ اس سفر میں کئی دفعہ کوچ گاڑی میں خود اپنے ہاتھوں سے رکھ چکا تھا۔ سوٹ کیس کے ڈمکن پر نام کے پہلے حروف جیلی حرفوں میں کندہ تھے۔ ”اے۔ کے“

وہ پلٹ کر کمرے سے باہر آیا۔ اور زینے کے سرے پر پہنچ گیا۔

”ایلن! ذرا اوپر آنا تو“ اس نے کہا۔

ایلن نے اپنا شوہر کو روکنے کے لئے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا لیکن وہ اس سے بچ کر زینے تک اور پھر زینہ چڑھ کر اپنے بھائی کے پاس پہنچ گیا۔ چارلس اسے اپنے ساتھ لے کر برآمدے میں چل پڑا دروازے میں سے گزر کر گزرگاہ میں پہنچا اور پھر ایلن کو دروازے پر لے آیا۔

وہاں پہنچ کر۔ ایلن ٹھٹھکا۔

”نہیں۔ ہم اندر نہیں جاسکتے۔“ وہ بولا۔

”کیوں؟“

”یہ کسی کی خواب گاہ ہے۔“

”لیکن کس کی؟“

”یہ میں کیسے جان سکتا ہوں۔“

چارلس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹا ہوا کمرے میں لے آیا

”یہ سوٹ کیس کس کا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

ایلن نے سوٹ کیس کی طرف دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سوٹ کیس کے

ڈمکن کو چھو کر دیکھا۔ وہ وہاں سے ہٹ کر مسری کے قریب آکھڑا ہوا اور اس پر تہہ کر کے رکھا ہوا شب خرابی کا لباس اٹھا کر دیکھا اور مارے حیرت کے اس کی آنکھیں

سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس طرف دیکھنے لگا جس طرف دونوں عورتیں دیکھ رہی تھیں۔

وہاں ایک طویل القامت اور دھلا پتلا شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لمبوتر اور خشک سا تھا اور آنکھیں بڑی بڑی اور بھری ہوئی۔ وہ ہر اٹھائے سینہ تانے اور بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔ اس نے وجود پر جنازہ کا سا بالکل کالا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ ایک قدم بڑھا کر روشنی میں آگیا اور اس کے زرد اور پر شکن چہرے پر کے مروجہ سے نفوش اور بھی گہرے اور بھیانک ہو گئے۔

”کیا مطلب ہے اس کا؟“ ایلیں نے غرا کر کہا۔

اس بھوت جیسے شخص کی خلاف توقع آمد نے ایلیں کو گویا چونکا دیا تھا اور اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کیوں کہ یہ شخص ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قبر سے نکل آیا ہو ایلیں ان لوگوں میں سے تھا جنہیں بہت کم اور کبھی کبھی غصہ آتا ہے لیکن اول تو اپنی بیوی کی چیخوں کی وجہ سے اور پھر اس احساس سے کہ اس وقت وہ بے حد خوفزدہ تھی ایلیں کو غصہ آگیا۔ ایسا شدید غصہ اور ساتھ ہی ساتھ حیرت و خوف سے ملے جلے جذبات اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔

”یعنی کیا مطلب ہے اس کا؟“ اس نے پھر پوچھا۔ اس دفعہ چیخ کر کہا۔

ہیلن نے ایسی آواز نکالی جیسے کتے کا پلا ”کوں۔ کوں“ کر رہا ہو۔

”اگر میں نے خواتین کو خوف زدہ کر دیا ہے جناب تو میں معافی چاہتا ہوں میرا مقصد یہ نہ تھا۔“

”اگر یہ مقصد نہ تھا تو پھر تم اس طرح کیوں نمودار ہوئے جیسے۔۔۔“ ایلیں نے کہا شروع کیا۔

ہیلن نمایاں طور پر کانپ رہی تھی اور اپنی نگاہیں اجنبی پر سے ہٹانہ سکتی تھی۔

اور یہ سوٹ کیس اور یہ سلمان خود چارلس کا تھا۔ ایلیں دروازے میں آکھڑا ہوا۔ ”یہ کیا اسرار ہے“ وہ بولا۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یا تو ہمارا دماغ چل گیا ہے یا پھر۔“

ایک فلک شکاف چیخ نیچے کے کمرے میں سے بلند ہوئی۔ خاموش برآمدے میں سے گزرتی ہوئی گزر گاہ میں در آئی اور اس کی دیواروں سے ٹکرا کر خاموش ہو گئی۔ فوراً ہی دوسری چیخ سنائی دی۔

”میرے خدا! یہ ہیلن کی چیخ ہے“ ایلیں نے کہا اور گزر گاہ میں بھاگ پڑا۔

چارلس اس کے پیچھے بھاگا۔ دونوں آگے پیچھے بھاگتے ہوئے گزر گاہ میں سے برآمدے میں آگئے اور بدستور بھاگتے ہوئے زینہ اترنے لگے۔

ہیلن کمرے کے بیچ میں کھڑی ہوئی تھی اور تیسری چیخ روکنے کے لئے اس نے اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی اپنے منہ میں ٹھونس رکھی تھی۔ ڈانٹا نے اپنا ایک ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیا تھا اور وہ دونوں اس طرف رخ کئے کھڑی تھیں جس طرف کمرے کی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ چارلس زینے کے مضبوط جھگے پر دونوں ہاتھ ٹیک کر اور

درجنوں خیالات ایلن اور چارلس کے دماغ میں گھلنا رہے تھے۔ اور وہ اس پراسرار اجنبی سے سینکڑوں سوالات پوچھنا چاہتے تھے لیکن معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہ شخص ان کے کسی سوال کا جواب نہ دے گا۔ اور اگر دیا بھی تو اس کا جواب گول مول ہو گا۔ جو انہیں کچھ زیادہ سی الجھا دے گا۔ چارلس کو غصہ بھی آرہا تھا اور بے چین بھی تھا لیکن اس نے اپنے ان جذبات پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب رہا۔ اس کے علاوہ اسے اس کا بھی اعتراف تھا کہ وہ بھوکا تھا، بھوک اس کی آنتیں کھاری تھی چنانچہ وہ ہر جذبے پر غالب تھی اور اسے کچھ بھی سوچنے نہ دیتی تھی۔

چنانچہ اس نے اثبات میں سر ہلادیا اور اجنبی جس اندھیرے دروازے میں سے نمودار ہوا تھا اس میں گھس کر غائب ہو گیا۔

”چارلس!“ ہیلن نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہم“

”خدا کے لئے یہاں سے چلو“ وہ بولی ”ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا ہے۔“

”اس کا تو مجھے اعتراف ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے بے حد پراسرار ہے۔“

چارلس نے کہا۔ ”لیکن بھائی! میں بھوکا ہوں چنانچہ اس وقت میں کھانے کے علاوہ کسی اور چیز کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا“

”تمیں آپ سے متفق ہوں“ ڈائنا نے سر ہلایا۔

”نہیں ڈائنا نہیں“ ہیلن نے جلدی سے کہا۔

”کیوں؟ کیا برائی ہے اس میں؟ پندرہ منٹ پہلے کیا حالت تھی ہماری؟ ہم وہاں چڑا ہے پر سردی میں ٹھہر رہے تھے، کسی بھی بستی سے سیلوں دور تھے اور پریشان تھے کہ کیا کریں اور کہاں جائیں اور اب ہم اس قعر میں ہیں، سردی سے محفوظ ہیں“

”اگر تم نہیں تھے اور یقیناً تھے تو ہماری اتنی بہت سی آوازوں کا جواب کیوں نہ دیا؟ ہم پکارتے رہے اور تم کانوں میں تل ڈالے بیٹھے رہے۔ یہ کیا مذاق تھا؟“

چارلس نے ایلن کی بات کاٹنے ہوئے کہا کیونکہ اسے خوف تھا کہ اس کا بھائی غصے میں کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جو اس اجنبی کو بری معلوم ہو۔

اجنبی کمر میں سے ذرا غم ہو گیا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو اور اس طرح وہ معافی طلب کر رہا ہو۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی لانی اور استخوانی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔

”خواتین کو خوف زدہ کرنا میرا مقصد نہ تھا“ وہ بولا ”دراصل میں آپ کا سلمان کبھی پر سے اتار رہا تھا اور آپ کے لئے کمرے تیار کر رہا تھا۔ امید ہے کہ اپنے کمرے آپ کو پسند آئے ہوں گے۔“

”واہ! بے حد عمدہ۔ لیکن میں سمجھا نہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ ایلن نے کہا۔

”اور نہ ہی میری سمجھ میں کچھ آیا ہے۔“ چارلس سر ہلا کر بولا۔

اجنبی کے ہونٹ کھینچ گئے اور اس کے دانت نمایاں ہو گئے اگر اس انداز سے اجنبی یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ مسکرا رہا تھا تو وہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام رہا تھا۔ کیونکہ اس کے چہرے کا یہ انداز اور ہونٹوں کا کھینچاؤ مسکراہٹ سے کوسوں دور تھا۔

چارلس نے کہا۔ ”ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ.....“

”میرے آقا کی مہمان نوازی مشہور ہے۔“ اجنبی نے جلدی سے کہا۔ اول تو یہ بھی نہیں جانتے کہ تمہارے آقا کون ہیں اور چونکہ ہم ان سے واقف نہیں ہیں اس لئے.....“

”حکم ہو تو میں کھانا لگا دوں؟“ اجنبی نے کہا۔

چند ٹائیوں کے شش و پنج کے بعد وہ ایلن کے ساتھ میز کی طرف چلی دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ان لوگوں کو میز پر بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ وہی پراسرار ملازم سوپ کی سروش دار قاب لے کر نمودار ہوا۔ اس نے سوپ کی قاب میز کے سرے پر رکھ دی اور خود اپنے ہاتھ سے ان قابوں میں سوپ ڈالنے لگا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔

”صاحب! مجھے کلیو کہتے ہیں“ ملازم نے جواب دیا۔

”ہاں تو کلیو!“ چارلس نے میز کے گرد لگی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں چار کرسیاں کیوں ہیں؟“

”اس لئے صاحب آپ چار ہی ہیں۔“

”میرا مطلب یہ نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ تمہارے آقا کھانے میں شریک نہیں ہو رہے ہیں؟“

”جی نہیں صاحب“

”کیوں؟ یہ تو اصول میزبانی کے خلاف ہے“

”جی ہاں صاحب“

”تو پھر کیوں شریک نہیں ہو رہے؟ ان کی طبیعت کچھ نامناسب ہے کیا؟“

”جی نہیں“

”پھر کیا بات ہے؟“

کلیو ان کی پلیٹ میں سوپ رکھ چکا تھا چنانچہ اب وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور اب اس نے چارلس کے سوال کا جواب دیا وہ کسی کو بھی چونکا دینے کے لئے کافی تھا۔ اس نے کہا۔

”ہمارے لئے کمرے تیار کر دیئے گئے ہیں۔ ہمارے لئے کھانا چنا جا رہا ہے اور اگر اس پراسرار ملازم کا آقا ایسا ہی ہوا جیسا کہ میں سمجھ رہی ہوں تو پھر ہماری تفریح طبع کا سامان بھی ہو جائے گا۔“

”اور تم اسے کیا سمجھ رہی ہو؟“

”ایک بے حد اڑاؤ قسم کا نواب جو لوگوں کو حیرت زدہ کر کے محفوظ ہوتا ہے اور پھر اپنی مہمان نوازی کا سکہ جمانے کے لئے انہیں خوب کھلاتا پلاتا ہے اپنی تعریف کروانے کے لئے انہیں ہر طرح سے آرام پہنچاتا ہے۔ مطلب یہ کہ بے دریغ دولت لٹانے والا اور خوشامد پسند نواب۔ تم جانو دنیا میں اب بھی ایسے سکی مگر دلچسپ اور باذائق لوگوں کی کمی نہیں۔“

”آؤ بھی میز پر بیٹھ جائیں۔“ چارلس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اگر بحث کرنا ہے تو میز پر بیٹھ کر ہوگی۔“

ایلن نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے میز تک لے آئے لیکن وہ اپنی جگہ پر جم رہی۔ ایلن نے اسے کھینے کی کوشش کی تو وہ کانپ کر بولی۔

”ایلن نہیں۔“

”ہیلن! آج یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے!“ ایلن نے الجھ کر کہا۔ ”تم ایسی تو نہ تھیں آج تو کچھ خوف زدہ نظر آتی ہو حالانکہ پہلے میں نے تمہیں کبھی خوف زدہ ہوتے نہیں دیکھا۔“

”ایلن! میرا دل کہتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے کوئی بھیانک واقعہ“

”کچھ ہونے والا نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم ڈنٹ کر کھائیں گے گہری سوئیں گے، صبح حسب وعدہ وہ نالائق کوچوان ہمیں لینے آجائے گا اور ہم ردا ہو جائیں گے۔ آؤ۔ آؤ بھی۔“

”صاحب! میرے آقا کا انتقال ہو چکا ہے۔“

آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کی گرمی کے باوجود چارلس کے رگ دریٹے میں سردی کی لہر دوڑ گئی اس کا پورا جسم برف ہو گیا۔ جیسے کوئی نظر نہ آنے والا دروازہ کھل گیا ہو۔۔۔۔۔ لیکن یہ دروازہ اس دنیا میں نہ کھلا ہو۔ بلکہ کوئی بے حد سرا اندھیری اور پراسرار دنیا میں کھل گیا ہو۔ جہاں سے غیر ارضی ٹھنڈک کی لہریں آ رہی ہوں۔ کلیو نے یہ الفاظ کچھ ایسے ٹھنڈے پن سے کہے تھے اور خود کلیو ایسا پرسکون و کہ پورا ماحول ہی پراسرار خوف زدہ کر دینے والا بن گیا تھا۔

”کلیو! یہ سب کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آیا اگر تم چاہو تو ہمیں بے وقوف کر سکتے ہو۔“ چارلس نے اپنی کانپتی ہوئی آواز کو راہ پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”لیکن اگر مناسب سمجھو تو ہمیں بتادو کہ ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟“

”کن باتوں کا صاحب“

”یہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ کھانے کی میز جو صرف چار آدمیوں کے لئے لگائی گئی۔۔۔۔۔ اور کمرے جو تیار ہیں ہمارے لئے۔۔۔۔۔ اور وہ تبھی جو ہمیں لینے آئی تھیں وغیرہ۔“

کلیو نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور کھانے کی میز پر بیٹھنے والوں کی طرف دیکھا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ وہ تقریر کرنے والا ہے بالکل اسی طرح جس طرح خاص دعوت میں میزبان کھانے کے بعد تقریر کرتا ہے۔

”صاحب!“ وہ بولا ”جیسا کہ میں نے کہا میرے آقا کا انتقال ہو چکا ہے لیکن ان کا حکم تھا کہ اس قصر کو دیران نہ ہونے دیا جائے بلکہ اسے ہمیشہ صاف ستھرا رکھ جائے اور جو بھی یہاں آئے اس کی خاطر مدارات کی جائے۔“

چنانچہ صاحب یہ قصر کسی بھی مہمان کے لئے کھلا ہے اور میں اپنے آقا کے

حکم کی تعمیل کر رہا ہوں اور اسی لئے آپ کو یہاں لے آیا ہوں۔“

”بڑے وفادار ملازم ہو تم۔ خیر تو کون تھے تمہارے یہ مرحوم آقا جن کی یہ آخری خواہش تم پوری کر رہے ہو؟“ کیا نام تھا ان کا۔؟“

کلیو نے اپنی جگہ ہلکی گھونٹ اٹھائی اپنی نظریں اٹھائیں اور اب وہ آتشدان کے ماتے پر دیکھ رہا تھا۔ وہاں دیوار میں چسپاں زرہ بکتر جو غالباً خاندانی علامت تھی۔

”میرے آقا کا نام“ کونٹ ڈریگولا تھا۔“

”کونٹ ڈریگولا۔“

”جی ہاں وہ ایک قدیم اور مشہور خاندان کے فرد تھے یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ان کی خدمت کا شرف حاصل ہوا۔“

”اب اس خطاب کا حامل کوئی نہیں ہے۔؟“

”جی نہیں! انہوں نے اپنے پیچھے کسی کو نہیں چھوڑا ہے جیسا کہ عام خیال ہے۔ اب میں معافی چاہوں گا۔“

وہ پلٹ کر جس طرف سے آیا تھا۔ اسی طرف چل دیا۔

ڈانٹا نے کہا۔ ”انہوں نے اپنے پیچھے کسی کو نہیں چھوڑا ہے والی بات تو سمجھ میں آتی ہے اور صاف بھی ہے لیکن۔۔۔۔۔ جیسا کہ عام خیال ہے کہنے سے کلیو کا کیا مطلب تھا؟“

”ایک اور سوال جس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔“ چارلس نے سوچا۔

وہ سوپ کی قاب پر جھک گیا اور چمچ میں لے کر اسے چکھا اور فوراً ہی چٹکارہ لے کر اپنا سر ہلا کر سوپ بے حد لذیذ تھا اور اس نے دیکھا کہ ڈانٹا، ایلن اور جیلن کو بھی سوپ پسند آیا تھا۔ چنانچہ وہ حل طلب مسائل کو بھول کر سوپ سڑپنے میں مصروف تھے اس پر پراسرار تبسمی، قصر اور اس کے پراسرار ملازم کلیو کے متعلق ان کے دماغ

ہے ہوئے تھا کہ ہم یہاں سردی میں ٹھہرتے رہیں گے لیکن اس کے برخلاف ہم یہاں بیٹھے مزے سے کھانا کھا رہے ہیں۔

”وہ خوفزدہ تھا۔“ ہیلن نے کہا۔

”خوفزدہ تو تم سب ہی تھے لیکن۔۔۔ چارلس نے کہا۔

”خوفزدہ ہی نہیں بلکہ وہ سا ہوا تھا اور انتہائی خوف سے پاگل ہو رہا تھا۔ جیسے

اے پتا ہو کہ یہاں کوئی بھیانک چیز ہو۔“ ہیلن نے کہا۔

”لیکن اس سے تو کسی کو انکار نہ ہوگا۔“ چارلس نے ہیلن کی بات سنی ان سنی

کر کے سلسلہ کلام جاری رکھا ”جب کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے کہ اس کا کوئی سربراہ

سمجھ میں نہیں آتا تو آدمی گھبرا جاتا ہے اور خوفزدہ بھی ہو جاتا ہے۔ یہ گویا فطری بات

ہے۔ تاہم بھائی اس سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ وہاں اس لکڑھارے کی

جموہوری میں ہم جو کھانا کھاتے وہ اتنا لذیذ نہ ہوتا جتنا یہ کھانا لذیذ ہے جو ہم اس وقت

ٹھونس رہے ہیں۔“

”میں اب بھی خوف زدہ ہوں۔“ ہیلن پہلے کی طرح اعصابی بیہوش میں اب بھی جلا

معلوم ہوتی تھی تاہم اس کا حالیہ سکون کچھ زیادہ ہی بے چین کر دینے والا تھا۔ اس

قصر میں کوئی خاص بات ہے جو۔۔۔۔۔“

چارلس ایک بار پھر اس خیال سے بے چین ہونے لگا تھا کہ ہیلن پھر ہسٹری کی

مرضیہ کی طرح چیخنے چلانے لگ جائیگی لیکن یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ

ایلن نے آگے کی طرف جھک کر اپنی بیوی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ابتداء میں ان

دلوں کے درمیان جذباتی رشتہ رہا ہوگا لیکن اب ان کے درمیان جو خشک مگر وفادارانہ

رشتہ قائم ہو چکا تھا وہ قابل احترام تھا بہت ممکن تھا کہ اب ان دونوں میں وہ تعلقات

قائم نہ ہوتے ہوں جو میاں بیوی کے لئے لازم و ملزوم ہیں تاہم جذباتیت کا ابتدائی دور

میں جو خیالات چکر لگا رہے تھے وہ اس وقت دماغ کے کسی تاریک گوشے میں عارضی

طور پر جا سوئے تھے۔ کونٹ ڈریکولا سے واقف نہ تھے۔ بلکہ انہوں نے اس کا نام بھی

نہ سنا تھا اور پھر چونکہ وہ مرد کا تھا اس لئے اس کے متعلق سوچنا حماقت تھی۔ یہ سب

کچھ اسرار سی جو ان لوگوں کو ایک افسانہ معلوم ہوتا تھا۔ اٹک لیلہ کی وہ داستان

معلوم ہوتی تھی جس میں ماسکی کو بادشاہ بنا دیا جاتا۔ لیکن یہ نہ افسانہ تھا اور نہ داستان

بلکہ حقیقت تھی۔ کہ وہ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے اور گرم و لذیذ سوپ پی رہے تھے

چارلس نے چمچ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں کل صبح ہمیں مل جل جائے گا۔“

”ہل۔! کاہے کاہل؟“

”قیام و طعام کا۔ اور کاہے کا۔“

ڈانکا کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ کلیو نے یہ اعلان کر کے کہ قصر کے آقا کا انتقال

ہو چکا تھا۔ اس کے اس حسین تصور کے تار و پود تو پہلے ہی سے بکھیر دیئے تھے کہ اس

قصر کا پر اسرار مالک بے حد فیاض اور مہمان نواز قسم کا اور کوئی سنگی شخص ہوگا اس کے

باوجود یہ یقین کرنے کے لئے قطعی تیار نہ تھی کہ دوسرے دن انہیں قیام کرنے اور

کھانے کا بل مل جائے گا۔

”ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔“ وہ بولی۔ ”بہت عمدہ شخص ہوگا یہ کونٹ ڈریکولا کہ

اپنے وصیت نامہ میں یہ لکھ گیا کہ اس قصر کو مسافروں کے لئے کھلا رکھا جائے اور ان

کی خاطر مدارات کی جائے۔“

”لندن وغیرہ میں یہ بات ممکن ہے ہی نہیں۔ بہر حال معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں

الف لیلہ کے شہزادوں کی قسم کے نواب اب بھی موجود ہیں۔“ چارلس نے کہا اس

کوچوان نے ہمیں چوراہے پر بٹخ دیا تھا تو یہ گویا نادانستہ طور پر وہ ہم پر کرم کر گیا تھا۔ وہ

بولے؟“ جیلن نے کہا۔

”اب یہ تو میں نہیں جانتا“ تاہم حقیقت یہی ہے۔“

اس کے باوجود چارلس نے یہی سوچا تھا کہ چونکہ فلوریشٹور ایک خانقاہ میں اور سب سے الگ تھلک رہتا ہے اس لئے کبھی کبھی اس کا دل بھی تو دنیا دار لوگوں سے ملاقات کرنے کو چاہتا ہوگا۔ وہ بھی چاہتا ہوگا کہ بیرونی دنیا کے کچھ لوگ اس کی خانقاہ میں قیام کریں۔ تاکہ وہ عبادت اور دنیاویات کو عارضی طور پر بھول کر ان مسمانوں سے دنیا کی بدلتی ہوئی حالت پر تبادلہ خیال کرے کیونکہ چارلس نے سوچا۔۔۔ فلوریشٹور کی باتوں سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے راہبوں کی طرح زاہد خشک نہ تھا۔ غالباً بلکہ یقیناً یہی وجہ تھی کہ اس لئے ان لوگوں کو اپنی خانقاہ میں آنے اور قیام کرنے کی دعوت دی تھی۔

”میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم یہاں آگئے“ چارلس نے کہا۔ اگر خانقاہ میں جاتے تو دنیاویات وغیرہ کی متعلق لکچر سننے پڑتے یہاں نہ تو راہب ہیں نہ برادر، نہ عبادت اور نہ ہی دنیاویات کے متعلق تقریر بازی اور یہ سب کچھ مرحوم کوئٹ کے طفیل ہے۔ چنانچہ ہم مرحوم ڈرنیکولا کے نام کا جام پیتے ہیں۔ خدا اسے کوئٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔“

”یہ الفاظ اس کی زبان نے ادا کئے ہی تھے کہ بغیر کسی تمہید کے ایک کڑک کی آواز کہیں اوپر سے سنائی دی جو بڑی تیزی سے لڑھکتی ہوئی نیچے آئی اور غالباً یہ کھلی تھی۔ جو قصر کی چھت پر گری اور قصر اوپر سے نیچے تک ہل گیا۔ کڑک کی آواز خاموش ہوئی تو کسی نظر نہ آنے والے پرند کے بازوؤں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز ابھری۔ یہ شاید چمکاؤر تھی۔ ساتھ ہی نیچے وادی میں بھیڑیے دو ایک دفعہ رو کر خاموش ہو گئے۔ اور آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کے شعلے گھڑی بھر کے لئے یوں جھک گئے جیسے کسی کو

گزر جانے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے حقیقی محبت کرتے تھے۔ اور جیسی تسکین کا دور گزر جانے کے بعد بہت کم جوڑوں میں یہ مقدس رشتہ قائم رہتا ہے۔“ شروع میں یہ سب باتیں بے حد عجیب معلوم ہوئی تھیں۔“ ایلن نے اپنی بیوی کو تسلی دی۔ لیکن اب سب باتیں سمجھ میں آگئی ہیں۔ چنانچہ گھبرائے اور خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دنیا میں اکثر دفعہ ایسے حیرت انگیز واقعات ہوتے ہیں۔ چنانچہ انسان کو انہیں قبول کر لینا چاہئے اور۔۔۔۔۔۔“

جیلن نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ تھم لیا۔
”خدا جانے کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کی عقلوں کو۔“ وہ بولی۔ ”یہاں جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ اچھا نہیں ہو رہا۔۔۔۔۔۔“

”اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی کہ ہمیں رات گزارنے کے لئے یہ قصر اور صیحت کی آگ بجھانے کے لئے گرم گرم کھانا مل گیا۔“ چارلس نے کہا۔
”ہم لوگوں کی عقل پر تو ایسے پتھر پڑے ہیں کہ تم یہ بھی بھول گئے کہ۔۔۔۔۔۔“

جیلن نے کہا
”کیا بھول گئے؟“

”یہ بھی بھول گئے کہ فلوریشٹور نے کیا کہا تھا؟۔۔۔۔۔۔ بھولے سے بھی قصر کے قریب نہ جانا۔ یاد ہے نا۔ یہ بھی بھول گئے؟“

”فلوریشٹور!۔۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔۔ یہ تو اس نے اس لئے کہا تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ ہم بحرِ محل کیلن برگ چلے چلیں اور وہاں پہنچ کر اس کی خانقاہ میں قیام کریں“ چارلس نے کہا اور اس لبریز جام کی طرف ہاتھ بڑھایا جو سوپ کی خالی قاب کے قریب دھرا ہوا تھا۔

”انہیں کیا ضرورت تھی۔ کہ ہمیں اپنی خانقاہ میں بلائے کے لئے جھوٹ

سجدہ کر رہے ہوں یا جیسے کسی دیو نے دوسری طرف سے ان پر ہونک دیا ہو۔

لیکن قصر کے کمرے میں کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے مسافروں نے ان باتوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ایلن اور ڈائنا نے قدرے شش و پنج کے بعد اپنا اپنا جام اٹھایا۔

”کونٹ ڈریکولا۔“ ڈائنا نے اپنا جام بلند کر کے کہا اور اس کی آواز کھوں کی وسعتوں میں گھوم گئی۔

اور فوراً ہی قصر کا پراسرار ملازم جس نے اپنا نام کلیو بتایا تھا قصر کی اندرونی اور انجانائی گزر گاہوں میں سے نکل آیا۔ کسی نے اسے آتے نہ دیکھا۔ اور کسی نے اسے آتے نہ سنا۔ وہ خاموشی سے آیا اور میز پر سے سوپ کی قافیہ اٹھا کر پشتی میں رکھنے لگا۔ لیکن اتنی مہارت سے کہ چینی کے برتنوں کی بھی ٹکٹھاٹ پیدا نہ ہوئی۔ کلیو کا چہرہ پتھر کے بت کے چہرے کی طرح ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا کلیو نے مسانوں کی طرف دیکھا۔ چارلس، ایلن اور ڈائنا اپنے اپنے جام میز پر رکھ چکے تھے۔

”کونٹ ڈریکولا۔“ ایلن نے سر ہلا کر کہا۔

لیکن کلیو کی نگاہیں۔ جیلن کے جام پر مرکوز تھیں اس کا جام میز پر ہی دھرا ہوا تھا اور بدستور لبریز تھا اس نے دوسروں کے ساتھ نہ تو جام اٹھایا اور نہ ہی کونٹ ڈریکولا کے نام کا جام پیا تھا۔

ایک عرصہ گزر چکا تھا ایک طویل مدت ہو چکی تھی ایک دور ختم ہو چکا تھا اور وہ انتظار کرتا رہا تھا۔ انتظار یہ عرصہ بے حد طویل تھا دس سال، جو انہیں دس صدیاں معلوم ہوئے تھے۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ کونٹ ڈریکولا کا نام سننے ہی وادی کے لوگ لرز اٹھتے تھے ہاں وہ دور بھی تھا کہ جب کلیو کالے گھوڑوں والی بکلی میں بیٹھ کر بہتی میں جاتا تھا۔ تو مائیں اپنے بچوں کو گھسیٹ کر سینے سے لگا لیتی تھیں، عورتیں کانپ کر گھروں کے کونوں میں دیک جاتی تھیں ڈریکولا کے نام کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اس کی ہیبت ہر دل پر طاری تھی وہ زمانہ بھی تھا جب بہتی سے آئے دن بچے غائب ہو جاتے تھے۔ اور پھر ان کے رونے کی آواز قصر ڈریکولا کے کسی کمرے میں سنائی دیتی تھی، جب اچانک لڑکیوں کی شہ رگ پر دو نشانات نمودار ہو جاتے تھے اور پھر وہ لڑکی سفید ہونے لگتی تھی کیوں کہ ڈریکولا اس کا خون نیا کرتا تھا۔ اور پھر قبریں، اپنے وحلے کھول دیتی تھیں اور مرنے والیاں چڑیل بن کر اپنی قبروں سے نکل آتی تھیں۔ اور بہتی سے بچے غائب ہونے لگتے تھے اور لوگوں کے دلوں میں کونٹ ڈریکولا کی ہیبت شدید سے شدید تر ہو جاتی تھی

لیکن اب وہ زمانہ گزر چکا تھا دس برس ہوئے کہ ایک منحوس شام اور سورج غروب ہونے سے پہلے جتنا تھن ہار کر، کوئی، ڈاکٹر سیورڈ اور آر تھریابی چار لہنتی انگریزوں نے کلیو کے آقا، کونٹ ڈریکولا کا خاتمہ کر ڈالا تھا، اور اس منحوس شام کے بعد حالات کا رخ بدل گیا تھا۔ کیوں کہ اب کونٹ ڈریکولا نہ رہا۔

تاہم اس کی ہیبت وادی کے لوگوں کے دلوں پر اب بھی طاری تھی چنانچہ لوگوں کا

زیب پہنچ گئے تھے ایک انگریز نے جس کا نام جتا تھن تھا۔ چھڑے پر چڑھ کر تابوت
نیچے لٹکا دیا تھا اور ان لوگوں نے تابوت کا ڈھکن کھول کر ایک طرف پھینک دیا تھا
اور اس تابوت میں کلیو کا آقا ڈرکولا دراز تھا۔ اسی انگریز نے جس کا نام جتا تھن تھا اپنا
ہاتھ لٹکل کر ڈرکولا کے حلق میں اتار دیا تھا۔ اور پھر اسے گھسیٹ کر وہ ظالم ڈرکولا کو
بیچ کر لے گیا تھا اور دوسرے انگریز کا چاقو اس وقت ڈرکولا کے سینے میں اتر گیا تھا اور
جب کونٹ ڈرکولا کا جسم ریزہ ریزہ ہو رہا تھا اس وقت کلیو نے جو ان خانہ بدوشوں کے
ساتھ تھا اپنے دل میں کونٹ کے یہ الفاظ سنے تھے کہ:

”ایک وقت آئے گا“ کلیو“ جب میں دوبارہ اٹھوں گا ایک بار پھر میری حکومت
ہوگی اور ایک بار پھر میرا دور دورہ ہوگا۔ ایک بار پھر لوگ میرا نام سن کر لرزے اور
کاٹنے لگیں گے“ تم میرا قہر آباد رکھو“ اس وقت کا انتظار کرو وہ ضرور آئیگا اور جب وہ
وقت آئے گا تو میری ان ہدایتوں پر عمل کرنا۔“

اور تب کلیو نے اپنے دل میں چند عین سنی تھیں اور اس دن سے لے کر اب
تک وہ اس وقت کا منتظر رہا تھا۔ جس کا وعدہ اس کے آقا نے کیا تھا۔ اور وہ بے حد
طویل اور صبر آزما انتظار تھا یہ۔

لیکن اب وہ وقت آگیا تھا۔ آج کی رات تمام باتیں ایسی ہی ہوئی تھیں جیسی کہ
کونٹ نے کہا تھا۔ کئی برسوں سے کوئی اس قہر کے قریب تک نہ آیا تھا۔ لیکن آج
رات چار انسان نہ صرف یہاں آئے تھے بلکہ قہر کی موٹی موٹی دیواروں کے اندر تھے
اور پھنس گئے تھے۔ لیکن انہیں پتہ نہ تھا کہ وہ کس جال میں پھنس گئے تھے۔ انہیں
معلوم نہ تھا کہ کیا ہونے والا تھا۔ انہیں ذرا بھی شک نہ ہوا تھا۔ کیوں کہ ان چاروں
مٹا سے کسی ایک نے بھی فرار ہونے کی کوشش اب تک تو نہ کی تھی۔ وہ یہیں تھے
اکی قہر میں تھے اور وہ وقت آگیا تھا جس کا انتظار نہ صرف کلیو کو بلکہ کونٹ ڈرکولا کو

یہ حال تھا کہ جب بھی کلیو کالے گھوڑوں والی بگھی میں سوار ہو کر بہتی میں جاتا تو اس
کے سامنے احرام سے جھک جاتے تھے یا پھر خوف سے سٹ کر اوپر اوپر ہٹ جاتے
تھے یا دبک جاتے تھے، لیکن کلیو اب زیادہ باہر نہ جاتا تھا کیونکہ اسے احساس تھا کہ
لوگوں کے دلوں سے ڈرکولا کا خوف رفتہ رفتہ دور ہو چلا تھا۔ اور اب خود کلیو کے لئے
یہ خیال سوہان روح بنا ہوا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے دلوں سے اس کے آقا
ڈرکولا کا خوف بالکل ہی جاتا رہے اور وہ کلیو پر حملہ کرنے کی ہمت کر بیٹھیں اگر ایسا
ہو تو پھر اسے کوئی نہ بچا سکے گا۔ کیونکہ اب اس کا آقا نہ رہا تھا، ظلمت کا وہ دیوتا مٹی
بن چکا تھا جس کے نام سے ایک ظالم لرز رہا تھا، اگر ایسا ہوا کہ لوگوں نے کلیو کو قتل کر
دیا تو پھر یقیناً وہ لوگ قہر ڈرکولا پر بلہ بول دیں گے اور انہیں روکنے والا کوئی نہ
ہوگا۔۔۔۔۔ لیکن شکر ہے کہ لوگوں کو اب تک یہ احساس نہ ہوا تھا۔ چنانچہ ٹھیک ہی تھا
کہ وہ پرانا شدید خوف اب تک ان کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ یہ ٹھیک ہی تھا کہ وہ
اب تک پرانی باتیں نہ بھولے تھے اور نہ بھولے تھے کہ چاندنی راتوں میں سیمیں
ذرات قہر لگتی ہوئی چٹیلوں میں تبدیل ہو جاتے تھے اور نہ یہ بھولے تھے کہ رات
کے اندھیرے میں کئی قبریں اپنے دہانے کھول دیتی تھیں اور ان میں سے ڈرکولا کی
دہائیں نکل آتی تھیں۔ ہاں۔ وہ لوگ یہ باتیں نہ بھولے تھے چنانچہ وہ اب بھی قہر کی
طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ڈرتے تھے۔ اور اب بھی ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ کرتے تھے۔
اور کلیو اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جو آنے والا تھا۔ کیونکہ اس کے آقا نے کہا
تھا کہ وہ وقت آئے گا“ اور ضرور آئے گا۔ کلیو کو یاد تھا کہ اس منحوس شام کو جب
خانہ بدوشوں کا ایک گروہ ایک چھڑے میں تابوت لادے قہر کی طرف لا رہا تھا، تو کیا
ہوا تھا۔ اسے یاد تھا کہ چار انگریز اس چھڑے کا تعاقب کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے
جالیا تھا اور پھر وہ خانہ بدوشوں سے لڑتے بھڑتے اور ان کا حلقہ توڑ کر چھڑے کے

ہٹا۔ کچھ جگتے میں اور کچھ سوتے میں کوئی سول پوچھا گیا اور پھر کوئی پوری طرح بیدار ہو گیا۔

ایک عورت کی آواز نے پوچھا۔

ایلیں! اٹھو! کیا تھا وہ؟

”ہوں۔ اوں۔ کیا بات ہے؟“

”ایلیں! اٹھو بھی۔ کسی نے میرا نام لے کر پکارا تھا۔“

”ارے نہیں۔ خواب دیکھا ہو گا۔ سو جاؤ۔“

”ایلیں! خدا کے لئے اٹھو۔“

”یعنی یہ کیا حماقت ہے کہ۔۔۔“

”سچ کہتی ہوں، کسی نے مجھے پکارا تھا۔“

”پکارا ہو گا۔ سو جاؤ اب۔ چپ۔“

”نہیں۔ خدا کے لئے اٹھو اور جا کر دیکھو یا ہر۔۔۔“

”یہ عجیب مذاق ہے بھی۔“

لیکن نہیں۔ یہ مذاق نہ تھا۔ گزرگاہ میں سے کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ ٹائی دی، یہ کلیو تھا جو بڑی تیزی سے چلتا ہوا گزرگاہ کے انتہائی سرے پر پہنچ گیا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے پورا قعر دفعتاً بیدار ہو گیا ہو۔ لیکن یہ لوگ اس کے حلق کیا جانتے تھے یا جان سکتے تھے؟ ہاں یہی بے وقوف لوگ جو آج رات قصر میں بے سکون اور اطمینان سے سو رہے تھے؟ ڈرکیلا کا نام ان کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا قصر ان کے لئے ایک ہوٹل کی طرح تھا جہاں انہیں رات گزارنے کے لئے کمرے مل گئے تھے۔ قصر کے زندہ مردہ مالک کے وجود سے یہ لوگ بے خبر تھے اور کلیو اسی قصر کے زندہ مردہ مالک کا ملازم تھا۔ اور اس پر اسے فخر تھا۔

بھی تھا۔ کونٹ انہی مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں آج رات کونٹ ڈرکیلا کی پیاس بجھائی جائے گی۔ اور پھر وہ ہو گا۔ جو کسی کے وہ مکان میں بھی نہ تھا۔

نیچے وادی میں بھیر پڑے چلا رہے تھے۔ بھیر پڑے، جنہیں کونٹ ڈرکیلا نے ”شہر“ کہا تھا۔ جن کی آواز اسے بہت پسند تھی اور جو اس کے تابع فرمان تھے، یہ بھیر پڑے خوشی سے چلا رہے تھے کیونکہ آج ہی رات کو وہ معجزہ ہونے والا تھا۔ کا وعدہ ظلمت کے دیوتا نے کیا تھا۔

اور قصر کی ایک گزرگاہ میں کلیو ٹپل رہا تھا اور ماضی کی تصویریں یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ ماضی۔۔۔ جو اب مستقبل بن جائے گا ماضی! تھا، حال برا رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کا آقا مجسم ہو گا وہ پھر سینہ گیتی پر چلتا پھرنا آئے گا۔ اس قصر میں ایک بار پھر اس کی فراہٹ اور اس کی دلیلوں کے قہقہے گونجیں گے۔ پھر وہی خون اور ظلمت کا دور شروع ہو گا۔ خون۔۔۔ جو اس کے آقا کی ماہ۔۔۔ اور ظلمت۔۔۔ جس کا دیوتا ہے۔ اس کا آقا۔۔۔ بھیر پڑوں کی چیخوں سے اور چنگاڑیوں کی ہمز پھڑاہٹ سے یہ وادی پھر آباد ہوگی۔ کیونکہ اب وہ وقت آگیا تھا۔ کلیو ٹپلے ٹپلے دیوار کے طعنے میں اٹھی ہوئی ایک مشعل کے قریب رک گیا۔

”ایلیں!“ اس نے آہستہ سے کہا۔

کچھ دیر تک وہ اسی جگہ کھڑا رہا، پھر وہ آگے بڑھا اور اب وہ ایک بند دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

”ایلیں!“ اس نے ایک بار پھر کہا۔

اور فوراً ہی بند دروازے کے پیچھے والے کمرے میں سے سرسراہٹ کی ہلکی آواز ٹائی دی، کسی نے بستر پر کھوٹ بدلی تھی، ایک جمالی لی گئی، کوئی نیند میں کچھ

”پہلوں۔“ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور کلیو جلدی سے پیچھے ہٹ کر چھپ کر ایلین دروازہ کھول کر باہر گزر گاہ میں آیا اس نے اپنے ایک ہاتھ میں موم بجی اٹھارہ تھی اور وہ خود مسلسل جھائیاں لے رہا تھا۔

وہ بڑا سائیکل اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ سال سے وہ اسی جگہ دھرا ہوا تھا اور وہ بھی گویا اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا یہ ٹرنک ایک غیر معمولی طور پر بڑا سبز صندوق معلوم ہوتا تھا جس میں کانٹس کے قلابے اور تالے لگے ہوئے تھے۔ بظاہر اس میں کوئی خاص بات نہ تھی لیکن کلیو جانتا تھا کہ اس صندوق میں کون سا خزانہ بندوق صرف وہ جانتا تھا کہ اگر حالات اس کے موافق ہوئے اور قسمت نے ساتھ دیا تو ہوگا۔ اگر ڈریکولا کی ہدایتوں پر صحیح طور سے عمل کیا گیا۔۔۔ اگر صندوق کا ڈمکر کھولا گیا اور وہ الفاظ کے گئے۔ اور حیات بخش سیال پیش کیا گیا تو کیا ہوگا۔۔۔ اس سے صرف کلیو واقف تھا۔۔۔ مٹی جسم بن جائے گی۔ عدم وجود میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور حقیر اور بے مصرف زندگی عظیم بن جائے گی۔ کلیو نے صندوق کا ایک ملف پکڑا اور اسے کھینچا ہوا گزر گاہ کے آخری سرے تک لے آیا۔ پیچھے سے گزر گاہ میں سے عیروں کی چاب سناٹی دے رہی تھی جو اسی طرف بڑھ رہی تھی۔۔۔ آہستہ آہستہ اور احتیاط سے لیکن کلیو نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ایلین نے اسے صندوق کھینٹ کر اس طرف لاتے دیکھ لیا تھا۔ اور اب وہ شوق تجسس سے بیتاب ہو کر اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ لیکن کلیو خوفزدہ نہیں بلکہ مطمئن اور خوش تھا کیوں کہ وہ یہاں چاہتا تھا۔

اپنے قیمتی بوجھ کی وجہ سے کلیو پسینہ پسینہ ہو رہا تھا لیکن اس نے شکایت نہ کی۔ اس کی رفتار دھیمی ہو گئی اور یہ صندوق کا بوجھ نہ تھا۔ جس نے کلیو کی رفتار کم کر دیا تھی، نہیں، بلکہ اس نے قصداً ایسا کیا تھا کہ وہ جو اس کا تعاقب کر رہا تھا، راستہ میں

سے ہی لوٹ نہ جائے۔ ہاں کلیو یہ نہ چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ چند ٹائیوں تک جہاں تھا وہیں کمرہ انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ اسے یقین ہو گیا کہ ایلین اب اس کے بہت قریب پہنچ گیا تھا اور اب اس نے دیوار پر لٹکے ہوئے ایک پردے کو ہٹایا اور صندوق کو ایک جھلکے کے ساتھ اس کے پیچھے کھسٹ لیا۔ پردے کے پیچھے دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ اس نے وہ دروازہ کھول کر اور اپنا دوسرا ہاتھ بڑھا کر اس نے پردے کو ایک آخری جھٹکا دیا، تاکہ وہ اس وقت تک ہٹا رہے جب تک کہ وہ سادہ لوح اور احمق انگریز اس کے قریب نہیں پہنچ جاتا، جو اس کا تعاقب کر رہا تھا اور جس کے لئے ایک خاص قسم کا انجام مقدر ہو چکا تھا۔

ایلین جو اس کا تعاقب کر رہا تھا، یقیناً زرا احمق تھا لیکن ایسا احمق جس کی رگوں میں مادہ حیات گردش کر رہا تھا۔ ایک انسان جس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ لیکن جو ذی روح تھا، جس کے جسم میں حیات بخشنے کے ضروری اور اہم اجزاء تھے۔ اور اب وہ وقت قریب تھا۔ بہت قریب تھا۔

پردے کے پیچھے دروازہ اور دروازہ کے پیچھے ایک چکر دار زینہ تھا اور کلیو اس صندوق کو اسی زینہ پر سے نیچے لئے جا رہا تھا۔

نیچے۔۔۔ نیچے۔۔۔ اور نیچے۔۔۔ یہاں تک کہ وہ سطح زمین پر پہنچ گیا لیکن وہ نہ رکا۔ وہ زینہ اترتا رہا۔ اس بیش بہا صندوق کو سنبھالے زینہ اترتا ہی رہا اور آخر کار تہ خانے میں پہنچ گیا۔ کلیو سے کہا گیا تھا کہ اسی تہ خانہ میں وہ مجبور ہوگا۔ دشمنوں نے جب یقین کر لیا تھا کہ اب ظلمت کے دیوتا کا خاتمہ ہو گیا تو اس وقت کونٹ ڈریکولا نے کلیو کے دل میں کہا تھا کہ اس ظاہری خاتمہ کے بعد اس کی۔۔۔ کونٹ ڈریکولا کی حیات نو کا آغاز ٹھیک اسی تہ خانہ میں ہوگا۔ اسی تہ خانہ میں شکست فتح میں تبدیل ہوگی۔ اسی جگہ سے کونٹ ڈریکولا کا ظہور ثانی ہوگا اور اسی جگہ بے نور آنکھوں کو

اس صندوق میں اور سوچنے دو، الجھنے دو کیونکہ مدت جلد وہ تمام محسوسات سے عاری ہو جائے گا کچھ ہی دیر بعد وہ کچھ نہ محسوس کر سکے گا، کچھ نہ سوچ سکے گا۔

صندوق کے پیچھے دیوار پر ایک عمدہ ریشمی لبادہ لٹک رہا تھا یہ لبادہ کالا تھا۔ جس پر سرخ دھاریاں تھیں۔ ایلن نے اس لبادے کی طرف دیکھا تک نہیں کیوں کہ اس کے نزدیک اس لبادے کی کوئی اہمیت نہ تھی وہ جانتا ہی نہ تھا کہ یہ لبادہ قصر کے مالک کونٹ ڈرکولا کا تھا۔

کلیو کے نزدیک ایلن بیوقوف تھا اور سمیٹ چڑھانے کے قاتل نہ تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ زندہ رہنے کے قاتل بھی نہ تھا۔

موم بتی کا شعلہ ذرا سا کانپ کر دھواں اٹھنے لگا اور پھر بے حرکت اور سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس کی روشنی اس کتبے پر پڑی جو تابوت کی لوح پر کندہ تھا۔ ایلن جھک کر اسے دیکھنے لگا۔

خود کلیو نے بڑی محبت سے، بڑے احترام سے، بڑی مشقت سے اور آہستہ آہستہ بڑی احتیاط سے اس کتبے کے X حروف کندہ کئے تھے اپنے آقا کے وعدوں کے باوجود اس نے یہ حروف اس چوکی پر کندہ کر دیئے تھے۔ کیوں کہ کلیو نے اپنا آخری فرض سمجھا تھا اور اس کے ذریعہ وہ اپنی وقاداری کا اظہار بھی کرنا چاہتا تھا اور اب وہ بڑی ثروت سے محسوس کر رہا تھا کہ اسے دوسرے بھی فرائض ادا کرنے تھے کیوں کہ اس کا وقت آگیا تھا۔

اپنی آنکھیں بند کر کے بھی وہ ان حروف کو صاف طور سے دیکھ سکتا تھا جو تابوت کی چوکی پر کندہ تھے اور جنہیں ایلن موم بتی کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ اور یہ حروف ایک خطاب اور ایک نام بتاتے تھے۔ ”کونٹ ڈرکولا۔“ نہ تو مرنے کی کوئی تاریخ لکھی ہوئی تھی نہ دنیا کی بے ثباتی ظاہر کرنے کے لئے

بیٹائی بخشی جائے گی اور اسی جگہ پیاس مٹائی جائے گی۔

ہاں اگر ہڈیوں پر عمل کیا گیا۔ اگر شہنشاہ پورے کئے گئے۔

اس بیوقوف نے جس کا نام ایلن تھا دروازہ تلاش کر لیا تھا جو پتھر کے پیچھے تھا چنانچہ اب وہ بڑی احتیاط سے چکر وار زینہ اتر رہا تھا۔ وہ تہ خانہ میں آگیا۔ اس کے انجوں نے تہ خانے کے فرش کو چھوا۔ تو کسی کونے میں ایک چمکاڑ پھڑپھڑا کر دبک گیا اور موم بتی کا، جو ایلن کے ہاتھ میں تھی، شعلہ سمٹ کر لمحہ بھر کے لئے موم بتی کی سلاخ میں دبک سا گیا لیکن پھر فوراً ہی ابھر آیا۔ اور اس کی زرد مودہ سی روشنی کے سائے تہ خانے کی سفید دیواروں پر رقص کرنے لگے۔

کلیو ایک طرف دبک گیا۔ رسم کا پہلا مرحلہ اطمینان بخش طور پر ادا ہو چکا تھا۔ تہ خانے کے عین بیچ میں ایک شاندار چوکی پر پتھر کا ایک مرصع تابوت رکھا ہوا تھا اور اندھیرے میں کلیو کے قریب جو مرتبان غامبی کا ظروف تھا جو اس نے اس کالے صندوق سے نکال کر اپنے قریب رکھ لیا تھا۔ اور مرتبان میں وہ چیز تھی جو کلیو کو دنیا کی کسی بھی چیز سے زیادہ عزیز تھی وہ بیش بہا خزانہ جس کی حفاظت وہ دس سال سے کرنا آیا تھا۔ راکھ جو اب بھی ملکیت تھی۔ وہ خاک جو اب بھی گوشت و پوست میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

بشرطیکہ ہڈیوں پر پورا پورا عمل ہوا۔

ایلن تہ خانے میں اتر آیا۔ موم بتی کی روشنی اس صندوق پر پڑی جسے کلیو نے ایک کونے میں رکھ دیا تھا۔ صندوق میں سے مرتبان نکالنے کے بعد کلیو نے اس کا ڈھکن کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کچھ تو اس لئے کہ ایلن قریب آگیا تھا۔ اور ڈھکن بند کرنے کا موقع نہ تھا۔ اور کچھ اس لئے کہ اب اس صندوق میں کچھ نہ تھا۔ اگر ایلن نے جھانک کر اس صندوق میں دیکھا بھی تو وہ اسے خالی پائے گا۔ چنانچہ اس کو دیکھنے دو

کلیو آہستہ سے اپنی کمین گاہ سے نکل آیا۔ وہ بڑے اطمینان اور سکون سے ایلن کی طرف بڑھا۔ جلدی بچانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس رسم کی ادائیگی میں کسی اصول کی پابندی کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی اسے شان اور حکمت سے ادا کرنا تھا لیکن چونکہ وہ اپنے آقا کی ایک زبردست خدمت انجام دے رہا تھا اس لئے وہ بڑی شائستگی اور احترام سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ کسی قسم کی بھی آواز پیدا کئے بغیر طاق کے قریب پہنچ گیا اور ایک ہاتھ بڑھا کر کمبل کے پردے کا ایک کونا پکڑ لیا۔ ایلن چونک کر ایک دم سے اس کی طرف گھوم گیا۔

کلیو کے بشرے سے کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہ ہو رہا تھا۔ جیسے وہ پتھر کے بت کا چہرہ ہو۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپنا بڑا سا چاقو نکال لیا اب بھی وہ پرسکون تھا۔ خود اسے احساس تھا کہ اس کی کسی بھی حرکت سے عجلت اور گھبراہٹ ظاہر نہ تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اس کی ایک ایک حرکت بر محل تھی۔ حتیٰ کہ اس کی پھرتی میں بھی ایک عجیب رکھ رکھاؤ تھا ایک عجیب شان تھی چنانچہ جس پھرتی اس نے اپنا چاقو نکالا تھا وہ بھی خود کلیو کو ایک بڑی حسین اور قابل تعریف حرکت معلوم ہوئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خود کوٹ ڈرکولا اس کے قریب کھڑا اپنی ٹھہری ہوئی مگر گو بھدار آواز میں اسے ہدایتیں دے رہا ہو تاکہ معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔

کلیو کا چاقو والا ہاتھ تیزی سے بلند ہوا اور دگنی تیزی سے جھکا۔ چاقو کا تیز پھل ایلن کے بدن میں اس طرح آسانی سے اتر گیا جیسے یہ انسان گوندھے ہوئے آلے کا بنا ہوا ہو۔ ایلن نے اپنا منہ کھولا۔ شاید چیخنے کے لئے یا شاید کچھ کہنے کے لئے لیکن اس کے حلق سے جو دہنی ہوئی اور گٹھی ہوئی آواز نکلی اس کا کوئی مطلب نہ تھا۔

ایلن لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور اس کی پیٹھ دیوار سے لگ گئی۔ کلیو نے بڑے اطمینان سے لڑکھڑاتی ہوئی اس کے جسم میں سے چاقو کھینچ لیا، اس کا ہاتھ پھر بلند ہو کر جھکا اور

کوئی شعر کندہ کیا گیا تھا اور نہ ہی اس کے متعلق کوئی فرسودہ عبارت تحریر تھی کہ کوئی قیامت تک سکون سے سوتا رہے گا کیوں کہ کوٹ ڈرکولا کبھی نہ سویا تھا اور نہ سوئے گا۔ وہ کبھی سکون سے نہ سوئے گا۔ سکون اسے میرا ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ سکون تو بزدلوں کے لئے ہوتا ہے، وہی اس کی آرزو کرتے ہیں اور جب یہ قوفوں کا وقت آتا ہے تو شاید انہیں بھی قیامت تک سکون کی نیند بخشی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ انہیں ملنا ہی کیا ہے؟ ایلن سیدھا کھڑا ہو گیا وہ ایک بار پھر تمہ خانے کا جان لے رہا تھا۔

اور تمہ خانے کے اندر میرے کونے میں کھڑا کلیو اسے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی شکاری نظروں نے تمہ خانے کی دیوار میں وہ جگہ تلاش کر لی جس میں کلیو سویا کرتا تھا۔ ایک طویل طاق سا تھا۔ پورا قعر خالی تھا۔ اس میں بہت سی خواب گاہیں تھیں اور پھر قعر کا کوئی آقا نہ تھا، کوئی مالک نہ تھا چنانچہ کلیو جہاں چاہتا سو سکتا تھا۔ وہ خود اس قعر کا گویا مالک تھا۔ لیکن کلیو نے قعر کی آرام دہ خواب گاہوں سے کبھی فائدہ نہ اٹھایا تھا۔ اس نے اپنے اسی پرانے کھدوے چنگ پر سوتا پسند کیا تھا۔ جو اس تمہ خانے کی دیوار میں پھری سل جڑ کر بنایا گیا تھا۔ اپنے آقا سے یہ اس کی محبت ہی تھی جو اسے یہاں تمہ خانے میں اور اپنے آقا کی قبر کے پاس سونے پر مجبور کیا کرتی تھی لیکن یہ بات بھی صرف کلیو ہی جانتا تھا کہ کوٹ ڈرکولا کی قبر خالی تھی۔ اس میں کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی لاش اور نہ مٹی۔

ایلن نے وہ کمبل ہٹایا جو پردے کا ٹکڑا کر رہا تھا اس کے پیچھے دیوار میں ایک طویل طاق سا بنا ہوا تھا، اس طاق میں پھری ایک لمبی سل جڑی ہوئی تھی اور اس پر ایک پتھر پرانا بستر بچھا ہوا تھا۔

دشت زدہ ایلن پٹی پٹی آنکھوں سے بستر کی طرف دیکھنے لگا۔

کلیو مسکرایا۔ یہ انگریز بے وقوف ضرور تھا لیکن خون سے بھرپور تھا۔ کلیو نے چاقو پھینک کر ایلین کے گرتے ہوئے جسم کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اور اب اسے بڑی تیزی اور پھرتی سے کام کرنا تھا۔ ایلین کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اب وہ زندہ انسان نہ تھا۔ وہ ایک لاش تھا۔ وہ لاش کو تابوت کے قریب کھینٹ لایا اور اسے تابوت کی چوکی سے نیک لگا کر بٹھا دیا تاکہ اس کا خون بہہ نہ جائے۔ اس طرف سے اطمینان کر کے وہ بھرتہ خانے کی دیوار کے قریب پہنچا اور وہ رسہ کھول لیا جو ایک ستون کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ کلیو اور اس کالے صندوق کی طرح یہ رسہ بھی جیسے اس وقت اور اس گمزی کا انتظار کر رہا تھا۔

انتظار..... طویل انتظار..... ہر چیز خستہ تھی۔ دس برس سے ہر چیز تیار تھی لیکن کوئی اس جال میں نہ پھنسا تھا۔ لیکن اب چار انجانے شخص اس جال کے کنارے تک آگئے تھے۔ اور ان میں سے ایک شخص آخری قدم اٹھا کر اپنی منزل تک پہنچ چکا تھا۔ اب تین باقی رہ گئے تھے۔

کلیو اب بڑی پھرتی کا جوت دے رہا تھا کیونکہ اب ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اس نے اسے کا ایک سرا ایلین کی لاش کی ٹانگوں کے گرد لپیٹ کر مضبوط گرہ لگا دی۔ اس طرف سے فرصت پا کر وہ پھر ستون کے قریب پہنچا اپنی ٹانگیں پھیلا کر اور نیچے تہ خانے کے فرش پر جتا کر کھڑا ہو گیا۔ اور اب اس نے دونوں ہاتھوں سے رسے کا دوسرا سرا پکڑا

چاقو ایک بار پھر ایلین کے جسم میں تیر گیا۔ اور اب کلیو نے چاقو کھینٹ کر اپنے ہاتھ میں سیدھا پکڑ لیا جس طرح قصاب قربانی کے بکرے کو ذبح کرنے کے لئے سیدھا پکڑ لیتا ہے۔ اور پھر اس نے چاقو کی تیز دھار ایلین کے حلق پر پھیر دی۔ اس کے حلق پر اس سرے سے اس سرے تک ایک سرخی لکیری نمودار ہو گئی۔ کلیو نے اطمینان کا سانس لے کر دیکھا کہ ایلین کے حلق پر کی سرخی لکیر آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔



کلیو دوڑ کر وہ مرتان اٹھا لایا جو اس نے کالے صندوق میں سے نکالا تھا، پیسے احرام کا اظہار کرتے ہوئے اس نے مرتان کا ڈسکن کھولا۔ ڈسکن کھل چکا تو اس نے مرتان کا منہ تابوت کی دیوار کے کنارے سے لٹکا دیا اور آہستہ آہستہ اسے جھکانے لگا۔ بھورے رنگ کی مین راکھ مرتان میں سے تابوت کے پینڈے میں گرنے لگی۔ کلیو نے مرتان کو درمیان میں سے دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اسے تابوت کی دیوار کے کنارے پر آہستہ سے ادھر ادھر کھینٹنے لگا۔ راکھ تابوت کے پورے پینڈے میں، ہانسی سے سرہانے تک بکھر گئی۔ راکھ کی سطح ہموار ہونی چاہیے۔ کسی جگہ اس کی زمیری نہ ہو اور کوئی جگہ خالی بھی نہ ہو ورنہ وہ نہ ہو گا جو ہونا تھا۔ اور کلیو نے دیکھا کہ یہ شرط پوری ہو گئی تھی۔ راکھ کی سطح بالکل ہموار تھی اور وہ تابوت کے پورے پینڈے میں بکھری ہوئی تھی۔

مرتان خالی ہو گیا تو ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ یہ مرتان اب خالی تھا چنانچہ اب اس کا احترام بھی لازم نہ تھا۔ یہ اب ایک حقیر خالی رتن تھا جس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ بیٹا بھائی اس تابوت کے پینڈے میں بکھری ہوئی تھی۔ اس نے مرتان ایک طرف بیک کر ایک بار پھر اپنا چاقو اٹھالیا۔

دوسرے ہاتھ سے اس نے ایلین کی لاش کے بال پکڑ لئے کہ وہ جھولنے نہ پائے۔ ایک بار پھر اس نے چاقو کی تیز دھار لاش کے حلق کے شکاف پر رکھ دی اور تیزی سے چاقو چلانے لگا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ لاش کے بال پکڑے ہوئے تھا۔ اور سر کو اپنی پوری قوت سے نیچے کھینچ رہا تھا۔

چاقو اپنا کام بڑی تیزی سے کر رہا تھا چنانچہ جلد ہی ایلین کا سر تن سے جدا ہو گیا اور اب وہ کلیو کے دوسرے ہاتھ میں لٹک رہا تھا۔

سرخ خون کی دھاریں تابوت میں گرنے لگیں۔ کلیو نے ایلین کا سر ایک طرف

اور اسے کھینچنے لگا۔

ایلین کی لاش آہستہ آہستہ نیچے سے اٹھنے لگی۔ اس کی ٹانگیں اوپر تھیں اور سر نیچے۔ کلیو رسے کا سرا کھینچتا ہی رہا اور لاش اوپر اٹھتی رہی یہاں تک کہ وہ فرش سے پوری طرح اٹھ گئی۔ اب کلیو اس کا بوجھ محسوس کر رہا تھا اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ لیکن وہ رسے برابر کھینچنے جا رہا تھا۔ لاش اوپر اٹھ گئی وہ فرش سے کئی فٹ اوپر الٹی لٹک رہی تھی۔ کلیو کوشش کر کے اسے اس کے ٹھیک مقام پر لے آیا۔ لاش اب ٹھیک تابوت کے عین اوپر لٹک رہی تھی ٹانگیں اوپر اور سر نیچے۔ کلیو نے رسے کا دوسرا سرا ستون کے گرد لپیٹ کر وہاں بھی مضبوط کر دیا۔

لاش کے زخموں میں سے جیتا جیتا خون تابوت کے ڈسکن پر ٹپک رہا تھا۔ کلیو تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی استخوانی انگلیاں تابوت کی دیوار اور ڈسکن کی درمیانی دراڑ میں داخل کر دیں۔ اس نے کمر جھکا کر دانت پیس کر اور ہونٹ بھیج کر زور لگایا لیکن ڈسکن کو ایک انچ سے زیادہ اوپر نہ اٹھا سکا۔ اس نے پھر کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا ڈسکن بے حد وزنی تھا اور اسے اٹھانے کے لئے کلیو کو اپنے جسم کی پوری وقت صرف کرنا تھی۔ چنانچہ اب اس نے ڈسکن کے باہر کوٹکے ہوئے کنارے کے نیچے اپنا ایک کندھا لگایا اور اپنے دونوں ہاتھ ٹکسٹوں پر جما کر جو زور لگایا تو تابوت کا ڈسکن اوپر اٹھ گیا۔ کلیو نے اور زور لگایا۔ ڈسکن اوپر اٹھا اور تابوت کے کنارے پر سے پھسل کر تابوت کے دوسری طرف بڑی آواز کے ساتھ فرش پر جا پڑا۔

تابوت میں کچھ نہ تھا۔ اور خالی تابوت کے عین اوپر رسے سے بندھی ہوئی ایلین کی لاش الٹی لٹک رہی تھی۔ چونکہ وہ ہوا میں بلند تھی اس لئے ہولے ہولے گھوم رہی تھی۔

پھینک دیا۔

تابوت کے کناروں پر فوراً ہی بھورے رنگ کی ہلکی سی دھند نمودار ہو گئی اس دھند کو دیکھتے ہی کلیو کے دل میں خوف اتر آیا لیکن پھر جو کچھ ہونے والا تھا اس کا خیال اس کے خوف پر غالب آگیا اور اب وہ فرط انبساط سے کانپ رہا تھا۔ آخر کار اس کی محنت ٹھکانے لگ رہی تھی۔ انتظار کا طویل دور آخر کار ختم ہو رہا تھا۔

اب تک ان کے دل سے شک دور نہ ہوا تھا۔ حالانکہ اس کے آقا نے کہا تھا کہ اگر ہدایتوں پر عمل کیا گیا تو یہ ہو کر رہے گا۔ تاہم کلیو کو اس پر پوری طرح یقین نہ تھا لیکن اب اسے یقین ہو گیا تھا۔ حیات بخش خون تابوت میں ٹپک رہا تھا اور تابوت میں سے بھورے رنگ کی دھند اٹھ رہی تھی، گاڑھی ہو رہی تھی اور پھیل رہی تھی۔

کلیو گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اس کا آقا نیا جنم لے رہا تھا۔

دھند اور بھی گاڑھی ہو گئی، وہ مختلف مرغولوں میں تقسیم ہو گئی تہہ خانے میں ہوا کے جھوکے ظاہر ہے کہ نہ آسکتے تھے۔ اس کے باوجود دھند کے مرغولے تابوت میں سے نکل کر تہہ خانے میں بکھر گئے۔ جیسے ہوا انہیں گھسیٹ رہی ہو۔

لیکن دھند کا ایک موٹا سا مرغولہ تابوت میں ہی چکر کاٹا رہا اور پھر پھیل کر تابوت کے پینڈے میں بکھری ہوئی مٹی پر پھیل گیا۔ پائنٹی سے سرہانے تک۔

اور وہ ہونے لگا جس کا وعدہ کونٹ ڈریکولا نے کیا تھا۔

تابوت کے پینڈے میں بہت سی سرخ اور نیلی رنگیں پیدا ہو گئیں وہاں رنگوں کا جال سا بچھ گیا اور پھر ان رنگوں پر گوشت اور پتھروں کی تہ نمودار ہو گئی۔ فوراً ہی تابوت کے سرہانے ایک انسانی کھوپڑی کا خاکہ سا ابھرا۔ اس کھوپڑی میں آنکھیں تھیں بلکہ دو گہرے سوراخ تھے اور اس کے ہونٹ بھی نہ تھے لیکن دانتوں کی قفا ضرور تھی اور ان میں وہ دو دانت، جنہیں کتا دانت کہتے ہیں۔ کیلیے اور تیز تھے

بھیڑیے کے دانتوں کی طرح اور پھر کھوپڑی میں دو آنکھیں پیدا ہو گئیں اور دانتوں کو پہلے ہونٹوں نے ڈھک لیا۔ ایک ہاتھ بنا۔۔۔۔۔ ابتدا میں یہ ہاتھ خشک ٹہنی کی طرح چٹا اور کانچ کی طرح تھا۔

اور پھر وہ ہاتھ ٹھوس بن گیا۔ ہاتھ اوپر اٹھا، اس کی پتلی اور لابی انگلیوں نے تابوت کا کنارہ پکڑ لیا اور وہ آہستہ آہستہ اٹھنے لگا جو تابوت میں بن چکا تھا۔

کونٹ ڈریکولا دوسرا جنم لے چکا تھا۔ دس سال بعد ایک بار پھر وہ اپنے تابوت میں سے نکل رہا تھا۔ اس کی بے بسی اور بے چارگی کا دور ختم ہو چکا تھا۔

یکبارگی بجلی بڑے زور سے چمکی، گرمی اور دل دہلا دینے والی آواز افق تا افق لڑھکتی چلی گئی، کہیں دور جنگل کے قلب میں بھیڑیے ایک آواز ہو کر چلانے لگے لیکن عناصر کے تصادم اور بھیڑیوں کی چیخ و پکار کا مطلب کسی کی بھی سمجھ میں نہ آیا۔

قصر ڈریکولا کے مسمان بے خبر پڑے سوتے رہے۔ انہیں پتا بھی نہ چلا کہ کیا ہو گیا تھا اور دنیا والے بھی اس بات سے بے خبر رہے کہ کونٹ ڈریکولا وہ عفریت جو راتوں کو اپنی قبر سے نکل کر لڑکیوں کا خون پی لیا کرتا تھا۔۔۔۔۔ پھر بیدار ہو چکا تھا۔

اور وہاں، قصر ڈریکولا کے تہہ خانوں میں گھٹنوں کے بل جھکا ہوا کلیو خوف و ہیبت کے جذبات سے بے قابو ہو کر ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ وہ جو تابوت میں بن چکا تھا تابوت میں سے نکل آیا تھا۔ لیکن کلیو سراٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔ اور اب جب اس جانی پہچانی گونجندہ آواز نے اسے ایک حکم دیا تو اس وقت بھی کلیو نے سر نہ اٹھایا تاہم اس نے یہ ضرور محسوس کر لیا کہ اس کا آقا اس وقت کمزور ہو رہا تھا۔ بے حد کمزور۔۔۔۔۔ یہ کمزوری اس کی آواز سے بھی عیاں تھی۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی کیونکہ اس کا آقا ایک نہ دو، پورے دس سال سے پیاسا تھا اور دس سال بعد آج بیدار ہو رہا تھا۔

بہاؤں کی طرف دھیان نہ دیا اور گزر گاہ کے انتہائی سرے پر پہنچ گیا اور پردہ اٹھا کر دوسری طرف زینہ اترنے لگا۔ ہیلن اس کے پیچھے ہی زینہ اتر رہی تھی۔ وہ دونوں آگے پیچھے زینہ اترتے رہے۔ اور زینے کے قدموں میں پہنچ کر وہ رک گیا اور ہیلن کا ہتھار کرنے لگا۔

اور حواس باختہ ہیلن زینہ اتر کر اس کے قریب پہنچ گئی تو وہ اسے راستہ دینے کے لئے ایک طرف ہٹ گیا اور اپنے خون آلود ہاتھ سے تہہ خانے کی طرف اشارہ کر کے

”میں جا کر دوسروں کو بیدار کرنا ہوں۔“

ہیلن نے قدم آگے بڑھایا۔ اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ بس جیسے جنم کے عالم میں وہ آگے بڑھ گئی۔ کلیو زینے کے قدموں میں خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

اور وہاں تہہ خانے میں ہیلن کے شوہر کی لاش جس کا سر غائب تھا الٹی لٹک رہی تھی۔ اس کے جسم کے اس حصے سے جو کبھی ردن تھی۔ خون اب بھی قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ ہیلن نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملیں اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ حقیقت تھی اسے وہ ایک خواب پریشاں ہی سمجھے ہوئے تھی اور اس کا خیال تھا کہ یہ بھیانک خواب کچھ ہی دیر بعد غائب ہو جائے گا۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھی اور قصداً جیرخ شیخ کر آگے بڑھی کہ اگر وہ مری ہو تو اس کی آنکھ کھل جائے اور یہ بھیانک خواب غائب ہو جائے گا۔

”اور پھر اسے احساس ہوا کہ کلیو اس کی حیرت اور اس کے خوف سے محفوظ رہا تھا۔ اور ہیلن کو یقین ہو گیا کہ یہ خواب نہ تھا۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ بے شک اس کھلے ہوئے تابوت پر اوندھی لٹکتی ہوئی بے سر کی لاش اس کے شوہر کی ہی تھی۔

اس کو فحشا و کمزور آواز نے کلیو کو وہ حکم دیا تو موخر الذکر نے صرف اثبات میں سر ہلادیا۔ کئی برسوں کے بعد جو کلیو کو کئی صدیاں معلوم ہوئی تھیں اسے ایک بار پھر حکم مل رہا تھا چنانچہ اس کی زبان لنگ ہو گئی تھی۔

وہ سر ہلا کر اٹھا لیکن اس نے نظریں نہ اٹھائیں۔ وہ ہر قدم پر احتیاط کر رہی تھی۔ جھلکا تہہ خانے کے زینے تک اٹنے کے قدموں چلتا ہوا پہنچ گیا اور پھر پلٹ کر بدستور سر جھکائے زینہ چڑھنے لگا۔ وہ اوپر پہنچ گیا اور گزر گاہ میں پہنچ کر وہ اس خواب گاہ کی طرف چلا جس کا دروازہ کھول کر ایلن ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی باہر آیا تھا۔

اس نے خواب گاہ کے بند دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اس کے دونوں ہاتھ اب بھی خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ ایلن کے خون میں لیکن دستک دینے کے فوراً بعد ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ پشت کے پیچھے چھپالئے۔

آہستہ سے دروازہ کھلا اور ہیلن اپنے عین سامنے اور اپنے اتنے قریب کلیو کو کھڑا دیکھ کر کانپ گئی۔ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔

”مادام!“ کلیو نے کہا۔ ”بد قسمتی سے ایک حادثہ ہو گیا ہے۔“

ہیلن خاموش رہی۔ وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”آپ کے شوہر.....“ کلیو نے پھر کہا۔

لیکن ہیلن پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی صورت دیکھتی رہی۔

”آپ کے شوہر کے ساتھ ایک منحوس حادثہ ہو گیا ہے مادام۔ آپ فوراً تشریف

لائیے“ کلیو نے کہا۔

اور وہ پلٹ کر جس طرف سے آیا تھا اسی طرف چل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہیلن اس کے پیچھے پیچھے آرہی ہے۔

کلیو نے اپنی رفتار کم نہ کی حالانکہ ہیلن اسے پکارتی رہی۔ اس نے ہیلن کی

نے اپنا سر جھکایا اور اس کے دو نکیلے دانت ہیلن کی شہ رگ میں پیوست ہو گئے۔ خون کی ایک بہتی لکیر ہیلن کی گردن سے اس کے سینے تک رینگ گئی۔ کونٹ ڈر کیولا بڑی رغبت سے ہیلن کا خون چوس رہا تھا۔ دس سال بعد آج اس کی پیاس بجھ رہی تھی۔



اور ہیلن کی ایک دل خراش چیخ اس تہہ خانے میں گونج گئی۔ اور ایسی چیخ پورے دس سال بعد آج پہلی دفعہ اس قصر میں گونجی تھی۔ تھری سنگین دیواروں، خاموش اور اندھیری گزر گاہوں کے لئے اور خود کلیو کے لئے ایک دل نواز نغمہ تھی۔

ہیلن پھر چیختی..... وہ چلتی..... وہ اس تہہ خانے سے نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہ کسی بھی طرف بھاگ جانا چاہتی تھی۔

لیکن کہیں سے ایک دہلا پتلا سایہ نکل آیا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ کلیو خوف سے سمٹ گیا اور بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس دہلے پتلے شخص کے کندھوں سے وہ لبادہ لٹک رہا تھا جو اس وقت جب ایلن تہہ خانے میں آیا تھا دیوار کی ایک کھونٹی سے منگا ہوا تھا۔ وہی سرخ دھاریوں والا کالا لبادہ۔ قصر کا آقا ہیلن کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ لمبو ترا اور مزے کی طرح زرد تھا رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اور حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھوں میں عجیب چمک اور اس چمک میں عجیب قوت تھی جو کسی کو بھی جکڑ سکتی تھی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہیلن کی طرف بڑھا دیئے۔ ہاتھوں کی پیلی اور لائی انگلیاں شکاری پرندے کے پنجوں کی طرح تھیں۔ ہیلن لڑکھڑا کر ایک طرف جھک گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے ہوش ہو چلی تھی یا شاید ہو چکی تھی۔ کالے لبادے والے پتلے ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔

اور اس کے پیلے ہونٹ اس کے دانتوں پر کھنچ گئے، دو لالہ اور نوکدار دانت چمکنے لگے..... کونٹ ڈر کیولا مسکرا رہا تھا۔ اس نے ہیلن کے بے جان سے سر کو ایک طرف کر کے کندھے پر دھلکا دیا۔

بے ہوش عورت کی گردن میں ایک رگ، پھر رگ رہی تھی، شہ رگ کونٹ ڈر کیولا

چکے تھے۔

”میرے خدا اکیارہ بج گئے!“ وہ بڑبڑایا ”لیکن ایلن اور ہیلن نے ہمیں جگایا کیوں نہیں۔ یا وہ بھی اب تک پڑے سو رہے ہیں؟“

”وہ دونوں یہاں نہیں ہیں؟“

”کیا۔ آ۔ آ۔؟“

”وہ یہاں نہیں ہیں۔“

”تو کہاں گئے ہیں؟“

”چلے گئے۔“

چارلس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی لیکن سمجھ نہ سکا۔

”چلے گئے! کیا مطلب؟“

ڈانکا کی آنکھیں نم تھیں۔

”بالکل ہی چلے گئے“ اس نے روئی سی آواز میں جواب دیا۔

”یہ کیا ایک ہی بات رٹے جارہی ہو۔؟ صاف صاف کہو۔“

”وہ لوگ یہاں نہیں ہیں اور ان کا سامان بھی غائب ہے۔“

ڈانکا نے یہ بڑی عجیب بات کہی تھی چنانچہ اس کی پلوں میں پھنسے ہوئے نیند کے کڑے خود بخود جھڑ گئے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے!“

اس نے ایک دولتی سی جھانک کر لحاف ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ڈانکا پیاری تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟“ اس نے کہا اور اپنی ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکادیں۔

ڈانکا نے جواب دیئے بغیر نفی سر ہلا دیا۔

ایک ہاتھ اس کندھے کے گوشت میں اترا جا رہا تھا اور اسے بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا اور وہ ایک خواب میں اپنے آپ کو اس کو جوان کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو اسے کبھی پر سے گھسیٹ کر نیچے شیخ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

”چارلس!۔۔۔ اٹھو۔“

اور اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن دوسرے ہی لمحے پھر بند کر لیں۔ وہ دوبارہ سو جانا چاہتا تھا۔ کافی دن چڑھ آیا تھا اور روشنی بند پوٹوں میں سے اس کی آنکھوں میں پہنچ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ وہ لوگ شاید دیر تک سوتے رہے تھے۔ گزشتہ کل کی پریشانی کے بعد یہ گہری پرسکون اور طویل نیند ایک نعمت تھی۔

ڈانکا اس کے بستر کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ڈر تک گاؤں میں بے حد پرکشش اور حسین معلوم ہو رہی تھی۔ رات بھر کی نیند نے اسے تازہ دم کر دیا تھا۔ اور اس کے رخساروں کے گلاب کھل اٹھے تھے۔ چارلس کو اپنی بیوی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ بڑی فرمانبردار اور وفا شعار تھی لیکن کبھی کبھی وہ بڑی مستعدی کا ثبوت دیتی تھی اور اس وقت چارلس کا خود ڈانکا سے اس کی شکایت کرنے کو جی چاہتا تھا۔ مثلاً یہ کہ اب اس وقت خواہ خواہ اسے بیدار کر دینے کی کیا ضرورت تھی وہ اپنی مرضی سے اٹھتا اور دو چار تمیدی جمانیاں لینے کے بعد بستر میں سے نکلتا۔ بہر حال وہ بڑی بے دلی سے ایک کنبی کے بل نیم دراز ہو گیا۔

”کیا بات ہے“ اس نے کہا۔

اور پھر کروٹ لے کر اس ٹائم پیس کی طرف دیکھا جو میز پر رکھی ہوئی تھی گیارہ بج

وہ کمرہ عبور کر کے آتشان کے قریب پہنچا۔ آتشان خالی اور صاف تھا اس کے پیچھے میں راکھ کا ایک ڈرہ تک نہ تھا حالانکہ گذشتہ رات اس آتشان میں آگ جل رہی تھی۔

”کہاں ہے وہ الو کا پٹھا؟“ چارلس نے ایک دم سے پوچھا۔

”کون؟“ ڈانٹا سہم گئی۔

”وی۔ کیا نام تھا اس کا؟“۔۔۔۔۔ ہاں۔ کلیو۔“

”وہ بھی نہیں ہے۔“

”نہیں ہے!“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں نے اسے بلانے کے لئے گھنٹی بجائی تھی۔ لیکن جب وہ نہ آیا تو۔۔۔۔۔“

”تو کیا کیا تم نے؟“

”میں اسے دیکھنے کے لئے نیچے گئی۔ وہ کہیں نہ تھا۔ کلیو بھی غائب ہے

بڑی عجیب اور مضحکہ خیز بات تھی یہ تو۔ اس معنی کا ایک نہ ایک منطقی جواب

ہو گا ضرور۔ یہ تو تسلیم ہی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ الین، ہیلن اور کلیو راتوں رات غائب

ہو گئے تھے۔ چارلس کمرے میں سے نکل آیا۔ گزرگاہ عبور کر کے برآمدے میں اور

زنہ کے ماتھے پر آگیا۔

”کلیو۔“ اس نے آواز دی۔

نیچے کا بڑا کمرہ خالی تھا۔ گزشتہ رات جس میز کے گرد بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا

تھا۔ وہ میز وہیں موجود تھی۔ لیکن تنگی تھی۔

”کلیو۔“ وہ پھر چیخا۔

لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ ہاں البتہ اس کی آواز قصر کی سنگین دیواروں سے ٹکرا کر

اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا ڈرننگ گاؤن اٹھایا اور اسے پہنتا ہوا کمرے میں سے نکل کر گزرگاہ میں آگیا۔ ڈانٹا اس کے پیچھے تھی۔ دونوں اس کمرے میں پہنچے جو الین اور ہیلن کو دیا گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے کمرے میں ایک نظر ڈالی تو چونکا۔ یہ شاید الین اور ہیلن کا کمرہ نہ تھا۔ یہ تو کوئی انجانا سا کمرہ تھا۔ گذشتہ رات چونکہ وہ تھکن اور نیند سے چور ہو رہا تھا اس لئے اسے اپنے بھائی اور بھابی کا کمرہ یاد نہ آ رہا تھا اور اس وقت وہ شاید غلطی سے دوسرے کمرے میں آگیا تھا۔

کمرہ صاف ستھرا تھا اور پتنگ پر صرف ایک چادر بچھی ہوئی تھی اور اس کمرے میں کچھ نہ تھا۔ نہ تو سامان تھا نہ کچھ اور بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کمرہ ایک عرصے سے استعمال نہ کیا ہو۔

وہ پلٹ پڑا۔

ڈانٹا نے کہا ”یہ انہی کا کمرہ ہے“

”ایس!“ اس نے احمقوں کی طرح منہ پھاڑ دیا۔

”یہ وہی کمرہ ہے چارلس۔ میں جانتی ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ یقین کرو تم کسی دوسرے کمرے میں نہیں آگئے ہو بلکہ یہ وہی کمرہ ہے اور یہ میں یقین سے کہہ رہی ہوں۔“

چارلس کو بھی اس کا یقین تھا لیکن وہ یقین کرنا نہ چاہتا تھا کیونکہ چند حقائق اس کے حافظے سے دست و گریباں تھے۔ اگر واقعی یہ ان کا کمرہ تھا تو الین اور ہیلن کہاں تھے؟ ان کا سامان کہاں تھا؟ نہ تو ان دونوں کا کہیں پتہ تھا۔ اور نہ ان کے سامان کا چنانچہ یہ یقین کر لینا آسان نہ تھا۔ اس کے برخلاف یہ سمجھ لینا آسان تھا کہ وہ غلطی سے کسی دوسرے کمرے میں آگئے تھے اور یہ بات قرین قیاس بھی تھی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ الین اور ہیلن ہوا بن کر اڑ گئے ہوں۔

چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے ڈانٹا سے کچھ کہنے کے لئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لیکن ڈانٹا وہاں نہ تھی۔ وہ بھی غائب تھی۔ یہ کیا راز تھا؟ کیا اس پر اسرارِ حق میں انسان ہوا میں تحلیل ہو جاتے تھے؟



”جانتی ہوں۔۔۔۔۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“

اترے گئے۔

ان کے پیروں کی چاپ خالی دیران کمرے میں بڑی بھیاں انداز میں گونج گئی۔ یہ کمرہ انہیں گزشتہ رات بے حد آرام دہ اور خوشگوار معلوم ہوا تھا۔ لیکن آج بھی کمرہ اجاز اور بھیاں تھا۔ کمرہ اس کی ہر چیز بلکہ پورا قصر جیسے تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز سے کھڑکیوں اور دروازے سے اور اس کی دیواروں اور پردوں سے ایک عجیب طرح کی ہیبت نکلتی تھی ایک ایسی ہیبت جس کا تعلق اس دنیا سے قطعی نہ تھا۔ اور اب چارلس نے بھی دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ اگر وہ اس قصر سے نکل آئے، صحیح سلامت نکل آئے تو یہ واقعی ان کی خوش قسمتی ہوگی۔

باہر فضا سرد تھی اور ہوا کے جموئوں میں استرے کی سی کٹ تھی وہ دونوں پیچھے ہٹ کر دیکھے بغیر صحن عبور کر کے پل پر آگئے۔ خندق کے پانی پر برف جمی ہوئی تھی۔ وہ اسے عبور کر رہے تھے۔ کہ ہوا کا ایک جموئہ آگیا۔ اور ان کے کھلے ہاتھوں اور رخساروں پر سرد تھپڑ مار کر گزر گیا۔ برف باری شروع ہو چکی تھی۔ برف روکی کے گالوں کی طرح گر رہی تھی اور ہوا کے جموئے ان گالوں کو اڑاتے پھر رہے تھے کہیں کوئی ٹھنڈا ہوا لومڑا اپنی کمرہ آواز میں چیخ رہا تھا، لومڑی اس ایک آواز کے علاوہ ہر طرف موت کی سی خاموشی تھی۔

کوئی سو گز تک چلتے رہنے کے بعد وہ قصر ڈریکولا کی سرد سے نکل آئے۔ اور تب ڈاکا نے سوٹ کیس زمین پر رکھ دیئے اور کئی دفعہ اپنے ہاتھوں کو ہلایا۔ اور آپس میں رگڑ کر انہیں گرم کیا کیونکہ وہ ٹھنڈے چلے تھے۔ ڈھلان اترتے وقت انہیں راستہ میں سستانے کے لئے کئی دفعہ رکنا پڑا، گزشتہ رات جب وہ یہ ڈھلان چڑھے تھے تو ان کی رفتار تیز تھی کیونکہ وہ اس بجلی میں سوار تھے جسے وہ پراسرار اور سیاہ گھوڑے سمجھتے تھے لیکن اس وقت ان کی رفتار بے حد سست تھی، کیونکہ وہ پیدل تھے اور پھر

”ابھی اور اسی وقت۔۔۔“ اس نے چیخ کر کہا۔

چارلس نے پہلے کبھی اپنی بیوی کو اس عالم میں نہ دیکھا تھا۔ وہ غصے بھی تھی، خوفزدہ بھی اور رو بھی رہی تھی چنانچہ اس وقت اسے کچھ سمجھنا مناسب نہ تھا۔ جب تک کہ وہ اس قصر سے باہر نہیں نکل جاتے بحث فضول تھی۔ ڈاکا اس وقت اپنے آپ میں نہ تھی۔

چنانچہ وہ اپنی بیوی کا ہاتھ پٹانے لگا ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی باتوں سے اس کا غصہ اور خوف دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب چونکہ چارلس نے اس کی بات مان لی تھی اس لئے ڈاکا بھی اسے خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی لیکن وہ اپنے جذبات پر قابو حاصل نہ کر سکی اس کے ہاتھ بدستور کانپتے رہے اور چند ثانیوں بعد ہی وہ ایک بار پھر سوٹ کیسوں میں کپڑا ٹھونس رہی تھی۔

سوٹ کیس وغیرہ خامے وزنی تھی۔ چنانچہ چارلس نے چاہا کہ تھوڑا سا سامان بیس چھوڑ دیا جائے اور بعد میں کسی کو بھیج کر منگوا لیا جائے یا پھر کل سامان فی الحال یہی پڑا رہنے دیا جائے اور وہ دونوں خالی ہاتھ قصر سے نکل پڑیں۔ چوراہے پر اگر کوئی راہ گیر مل گیا تو اسے منہ مانگی رقم دے کر سامان لانے کے لئے بھیج دیں گے۔ لیکن جب اس نے ڈاکا کی صورت دیکھی۔ تو اس نے یہ مشورہ اپنے پاس ہی رکھا اس کے بشرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ چارلس کا یہ مشورہ کسی صورت تسلیم نہ کرے گی اس منحوس قصر میں ان کی کوئی چیز حتیٰ کہ ایک تنکا تک باقی نہ رہنا چاہیے۔ اپنا کل سامان لے کر اس بھیاں اور پراسرار قصر سے نکلنا اور بھولے سے بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا تھا۔

ان دونوں نے دو سوٹ کیس اٹھائے اور گزر گاہ کو عبور کر کے آہستہ آہستہ

جس۔ یہاں سے نظر آتے تھے، یہ قصر اور اس کے برج کسی بھی ٹھکے ہوئے مسافر کو لپکا کر اپنی طرف کھینچ سکتے تھے۔ اس دیرانے میں یہ قصر بڑی ہی پرکشش تھا۔ اور مسافر اس کی طرف دیکھنے کے فوراً بعد ہی اس پر بیچ راستے پر چل پڑتا جو اوپر جاتا تھا۔ قصر ڈریکولا کی طرف جو اسرار کا گڑھ تھا۔ نہیں وہ اس طرح یہاں سے نہیں جاسکتا اگر اس کے بھائی اور ہیلن کے ساتھ اس قصر میں کوئی واقعہ ہوا تھا۔ تو پھر اس کا یہ فرض ہو جاتا تھا کہ وہ اس کے متعلق تحقیق کرے اور وہ تحقیق کرے گا۔

ڈائنا نے اس کی دلی کیفیت معلوم کر لی۔ چنانچہ بولی۔

”چارلس! نہیں..... خدا کے لئے نہیں..... تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ.....“

”ڈائنا! میرا ایک بار پھر وہاں جانا بہت ضروری ہے۔“

”میری خاطر چارلس.....“

”لیکن میرے بھائی الین کا کیا ہوا؟ میری بھائی ہیلن کا کیا ہوا؟ کیا جواب دوں گا؟ میں لوگوں کو؟ اور اگر میں اس وقت انہیں چھوڑ کر چلا گیا اور بعد میں کبھی ان کے متعلق کوئی خبر نہ ملی تو میرا ضمیر مجھے ملامت نہ کرے گا۔؟“

”کیا میری زندگی اجیرن نہ ہو جائے گی۔؟“

”کم سے کم میری ایک بات تو مان لو۔“

”کون سی بات؟“

”ہم جوزف باو چلتے ہیں۔“

”چھا پھر؟“

”پھر ہم مدد لے کر آجائیں گے۔“

”کسی مدد اور کسی کی مدد ڈائنا؟“

سلمان بھی اٹھائے تھے۔

چارلس کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ دونوں اس قصر کے پر اسراریت معلوم کے بغیر اس میں سے نکل آئے تھے جیسے جیسے وہ قصر سے دور ہوتا جا رہا تھا اس کی بے چینی اور شوق تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ ڈائنا کے دماغ پر فرار..... صرف فرار سوار تھا، لیکن جب وہ یہاں سے دور پہنچ جائیں گے اور خدا کا شکر ادا کر رہے ہوں گے۔ کہ وہ یہاں سے صحیح سلامت نکل آئے تو پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟۔ اپنے وطن میں پہنچ کر وہ ہیلن اور الین کی گمشدگی کے متعلق اپنے دوستوں سے کیا کہیں گے؟ کیوں کہ یہ تو انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ ان دونوں کے ساتھ کیا واقعہ ہوا تھا؟ وہ آسمان پر چلے گئے یا زمین میں دھنس گئے؟ کوئی پیغام اور اپنا کوئی نشان تک چھوڑے بغیر وہ دونوں آخر کہاں جاسکتے تھے؟

”شاید رات کے وقت وہ دونوں کسی وجہ سے خوفزدہ ہو گئے اور راتوں رات قصر سے نکل کر کسی طرف چل دیئے۔“ چارلس نے خود اپنی ڈھارس بدھانے کی کوشش کی۔

لیکن اگر ایسا ہی تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایسی بھی کیا بات تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی کچھ کے بغیر فرار ہو گئے تھے؟ نہیں یہ ممکن ہی نہ تھا۔ کہ وہ دونوں ڈائنا اور چارلس کو اپنے ساتھ لئے بغیر چلے جاتے۔

ڈائنا اور چارلس ڈھلان سے اتر کر چوراہے پر پہنچ گئے انہوں نے اپنا اپنا سامان لکڑہارے کی جھونپڑی کے قریب رکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔

چاروں سمتوں میں جاتے ہوئے چاروں راستہ خالی اور ویران تھے۔

چارلس نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا جس طرف سے وہ آئے تھے۔ قصر ڈریکولا کی فصیل اور برج، جن کی چوٹیاں برف کے گالوں کی وجہ سے سفید ہو رہی

”کچھ ہی کیوں ہو جائے؟“ ڈانٹا نے بڑے میکانیکی انداز میں دہرایا۔

چارلس نے اسے اپنی بانسوں میں سمیٹ لیا اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولا ”ڈانٹا میں بلاوجہ کوئی خطرہ مول نہ لوں گا اس کا میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں سچ کہہ رہا ہوں۔“ چارلس نے اسے یقین دلایا ”لیکن بہر حال معلوم کرنا ہے کہ الین اور جیلن کے ساتھ کیا واقعہ ہوا۔ یہ تو بڑی بزدلی ہے کہ ہم خاموشی سے اپنی شکست قبول کر لیں۔“

”شکست! کون شکست دے رہا ہے ہمیں؟“

”وہ..... وہ..... ایک خالی مکان۔“

”چارلس!“

”کیا ہے؟“

”پانچ بجے اندھیرا اتر آتا ہے۔“

”لیکن تم اندھیرے سے نہیں ڈرتے؟“

”اس جگہ یہاں ڈرتی ہوں۔“

”بہت اچھا۔ میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“

اور اس نے ڈانٹا کے ہونٹ چوم لئے، ڈانٹا نے اس بوسے کا جواب بڑے خلوص سے دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے آپ کو ڈانٹا سے الگ کر چکا تھا اور اس سے پہلے کہ موخر الذکر کچھ کہتی یا کوئی التجا کرتی وہ اس راستے پر چل پڑا۔ جو قعر ڈریکولا تک جاتا تھا۔

دن کی روشنی میں قعر ڈریکولا ایک بے حد معصوم قدیم عمارت معلوم ہوتا تھا۔ اور اس عمارت کے مختلف حصوں کی تعمیر مختلف ڈھنگ سے کی گئی تھی۔ چارلس نے

”وہاں کے باشندوں کی۔“

”کوئی ہماری مدد نہ کرے گا۔“

”آخر کیوں؟“

”اس لئے کہ مقامی لوگ اس قعر کے وجود کا اقرار ہی نہیں کرتے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ قعر موجود ہے۔ کچوان نے بھی انکار کر دیا تھا اس نے قعر کی طرف دیکھا تک نہیں۔ یہاں کے لوگ اس کے متعلق کچھ بھی کہنے کو تیار نہیں ہیں پھر وہ ہماری مدد کیا کریں گے؟“

”ڈانٹا نے گردن گھما کر قعر کی طرف جاتے ہوئے راستہ پر نظری جیسے اسے خوف ہو کہ کوئی دم میں وہی پراسرار کچوان کی تبھی آتی نظر آئے گی۔

”بہت اچھا۔“ اس نے کہا۔ اگر ہمیں واپس جانا ہی ہے تو.....“

”تم نہیں ڈانٹا۔“ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ چارلس نے کہا۔

”اور میں؟“

تم یہیں رہو۔ اگر کوئی تبھی یا کوچ گاڑی اس طرف سے گزرے تو اسے روکنے کی کوشش کرنا۔ بشرطیکہ وہ بے کچوان کی نہ ہو۔ اب اگر تم کچوان کو قعر تک آنے کے لئے تیار کر سکو تو کہنا۔“

”اور اگر وہ نہ آئے تو؟“

”تو پھر تم خود جوزف باوچلی جانا، کم سے کم ہمارا سامان ہی بھیج دینا اور تم اسی جگہ میرا انتظار کرنا۔“

”انتظار کروں؟“ ڈانٹا نے خوف سے کانپ کر کہا۔

”اس وقت دھائی بج رہے ہیں۔“ چارلس نے کہا۔ ”میں ساڑھے چھ بجے تک

واپس آجاؤں گا، خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔“

نہیں طریقے سے وہ نمودار ہوا تھا اور الین اور ہیلن۔۔۔۔۔
اور خیالات کا دھاگہ یہاں کٹ سے ٹوٹ گیا۔

یہ بات قرین قیاس نہ تھی کہ ان کے ساتھ کوئی واقعہ ہو گیا ہو۔ الین دولت مند فرد تھا۔ لیکن اتنا بھی نہ تھا کہ اس کے ساز و سامان میں کوئی قیمتی چیز ہو، چنانچہ اب کسی نے الین اور ہیلن کو اس غرض سے کہیں قید کر دیا تھا کہ وہ بعد میں چارلس سے درہنگاری طلب کرے تو یہ اس کی حماقت تھی۔ کیونکہ انگلستان سے اتنی بڑی رقم منگوانے کے لئے کافی وقت درکار تھا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ کوئی بھی ڈاکو اتنا گدھا تو نہیں ہو سکتا چنانچہ کسی ڈاکو یا راہزن نے ان دونوں کو روپے کے لالچ میں گم نہ کیا تھا اور اس کے متعلق سوچنا فضول تھا۔

چارلس زندہ چڑھ کر گزر گاہ اور وہاں سے خوابگاہ میں پہنچا۔ اس نے اس کمرے کا ایک ایک کونہ دیکھ ڈالا اور ایک ایک چیز کو بار بار اور بڑی باریک بینی سے دیکھا۔ لیکن اسے کوئی ایسی چیز نہ ملی جو ہیلن اور الین کی گمشدگی کے معنی کو حل کر سکتی یا اس پر کم سے کم کچھ روشنی ہی ڈال سکتی

گزر گاہ کی کھڑکیوں میں سے اس نے قصر کے اندرونی صحن میں نظری قصر کا سایہ صحن میں اس سرے سے اس سرے تک پہنچا ہوا تھا صحن اجاز اور سرد تھا اور اس تک پہنچنا ناممکن تھا۔ تاہم وہ قصر کی طرح خوفناک اور ڈراؤنا معلوم نہ ہوتا تھا صحن کے انتہائی سرے پر دیوار تھی اور دیوار کے عقب میں بلند دیوالا اور سائے دار درختوں کی قطار اور یہ درخت یوں کھڑے تھے جیسے کسی محاذ پر سپاہی صف بنائے کھڑے ہوں۔
چارلس آگے بڑھا۔

وہ دروازے کھول کر خالی خوابگاہوں اور فرنیچر سے محروم نیچے کمروں میں جھانکتا رہا۔ قصر ڈریکولا نہ تو کسی کا گھر تھا اور نہ ہی قابل دید مقام جسے دیکھنے کے لئے سیاح

اس قصر کو زیادہ اور کوئی خاص اہمیت دینے کی کوشش نہ کی وہ اس قصر کو بس ایک قدیم عمارت ہی یقین کرنا چاہتا تھا جس کی تعمیر مختلف زمانوں میں مختلف معماروں نے کی تھی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر اس نے اس قصر کو پراسرار نہ سمجھا اور اپنے دل میں خوف دہرا اس کو جگہ نہ دی تو اس کا کام آسان ہوگا۔ وہ بڑے اطمینان سے اس کے اسرار معلوم کر سکے گا بشرطیکہ اس میں اسرار ہوں۔

اور جب وہ خندق کا پل عبور کر رہا تھا تو اب پہلی دفعہ اس نے دیکھا کہ یہ پل مرمت طلب تھا اور خندق کا پانی جم کر سج ہو گیا تھا اور اس کی سطح پر بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ یہ پتھر قصر کی فصیل اور دیواروں پر سے ٹوٹ کر گرے تھے، گزرے ہوئے زمانے کے اثرات اس پر اب بوجھ بن چلے تھے۔ جگہ جگہ سے قصر کی دیواروں کا پلاسٹر اکڑ رہا تھا اور پتھرائی جگہ سے اکھڑنے لگے تھے تاہم یہ قصر مضبوط تھا، بے حد مضبوط تھا۔ اور پٹاری کی چوٹی پر اپنے برج اٹھائے ایک ابدی پاسان کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ مستحکم عظیم اور پر ہیبت کئی صدیوں کے بعد بھی یہ آج کے زمانے میں بھی اسرار لوگوں کے دلوں پر طاری تھے، بھول چکے ہوئے اور ان اسرار کو بھی فراموش کر چکے ہوئے جو اس کی سنگین چار دیواری میں بند ہیں کوئی نہ جانے گا کہ یہ کھنڈر ایک قصر تھا اور کسی کو معلوم نہ ہو گا کہ اس قصر کا مالک کون تھا؟

چارلس دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے کواڑوں کو آہستہ سے دھکیلا وہ کھل گئے۔ گزشتہ رات انہوں نے اس بڑے کمرے اور اپنی خوابگاہوں کے علاوہ اس قصر کا کوئی اور کمرہ نہ دیکھا تھا اور نہ ہی چارلس کو اس بات کی دھن تھی کہ وہ قصر اندرون کا کھنج لگائے چارلس نے تجسس طبیعت نہ پائی تھی اور اگر حالات مختلف ہوتے تو وہ قصر کے کمروں اور گزر گاہوں میں ٹانگ جھانک کرنے کو بد اخلاقی سمجھتا، لیکن اس کا مالک زندہ نہ تھا اور وہ تھا ایک ملازم اسی پراسرار طریقہ سے غائب ہو گیا

سے نہیں بلکہ کہیں نیچے سے آ رہی تھی ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس کے پورے بدن کو چھوڑ کر صرف اس کے ٹخنوں کو چھوتی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے پردے کا ایک حصہ ذرا سا ہٹا دیا، دوسری طرف ایک تاریک دروازہ تھا جس کے کواڑ نہ تھے اس دروازہ سے ایک زینہ شروع ہو کر کہیں نیچے چلا گیا تھا اوپر کی چند سیڑھیاں گزر گاہ سے آتی ہوئی روشنی میں نظر آ رہی تھی، اور بعد کی سیڑھیاں گھپ اندھیرے میں گم تھیں۔

ایلن اس گزر گاہ میں چلا ہوا، اسی طرف آیا ہو گا اور اسے بھی پردے کے پیچھے دیوار میں یہ دروازہ مل گیا ہو گا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اسے اپنی خواب گاہ میں سے نکلنے اور یہاں تک آنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟ اور وہ یہاں تک کیوں آیا تھا؟ اگر آیا تھا تو نیچے کیوں گیا تھا اور یہاں بھی اس کے پیچھے پیچھے کیوں گئی؟

چارلس جہاں تھا وہیں شش و پنج کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ اس زینے کے ذریعہ نیچے اترنے سے ہچکچا رہا تھا، ایلن اور ہیلن اسی راستہ سے جا کر غائب ہو گئے تھے نیچے کے کمرے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی عفریت کوئی بلا جس نے ان دونوں کو کسی طرح اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور پھر انہیں نگل لیا تھا بہت ممکن تھا کہ وہ بلا سے یا جو کچھ بھی وہ تھا۔ اب بھی اس زینہ کے قدموں میں موجود ہو اور اب بھی وہ بھوکا اور پیاسا ہو۔

لیکن وہ کیا ہو سکتا تھا؟ اس ویران اور غیر آباد قصر کے یہ خانہ میں کون ہو سکتا تھا؟ وہ دل کڑا کر کے زینے کی طرف بڑھا۔

دروازہ نچا تھا چنانچہ چارلس کمر میں سے ذرا جھک گیا کہ اس کا سر محراب سے ٹکرائے جائے وہ دھڑکتا دل لئے ٹیڑھیاں اترنے لگا چند سیڑھیوں کے بعد اوپر سے آتی ہوئی روشن غائب ہو گئی لیکن آگے کی سیڑھیاں پھر روشنی تھیں اوپر چھت میں

آتے، یہ ایک لاوارث اور ترک شدہ عمارت تھی اس کے باوجود..... اس میں قالین بچے ہوئے تھے، دیواروں سے پردے لٹک رہے تھے، اور گزشتہ کی ٹخلی منزل کے پردے کمرے کے آئینہ میں نہ صرف آگ جل رہی تھی، بلکہ ان چاروں مسافروں کے لئے کھانا بھی تیار کیا گیا تھا، اور چارلس کی عقل اس معرکہ کو حل کرنے سے قاصر تھی۔ اس نے قصر کے باورچی خانے میں جانے کا فیصلہ کیا یقیناً وہاں سے یہ سرخ تول ہی جائے گا۔ کہ گزشتہ رات وہاں کھانے پکایا گیا تھا، شاید کلیو پھر نمودار ہو جائے، شاید اسے بولنے پر مجبور کیا جاسکے اور وہ اس راز پر سے پردہ اٹھا سکے اور چارلس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بڑبھڑکی ہوئی تو وہ اسے مجبور کر دے گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو وہ تشدد سے بھی کام لے گا..... ہر طور وہ کلیو سے یہ راز آگوا لے گا۔

وہ گزر گاہ میں چل پڑا ایک دیوار پر کا پردہ آہستہ آہستہ تقریباً نامعلوم طور پر مل رہا تھا۔ اوپری منزل تقریباً نکلی تھی البتہ کہ محض رسا۔ اس میں سجاوٹ کی چند چیزیں رک دی گئی تھیں اور یہ پردہ انہی چند چیزوں میں سے ایک تھا۔ قصر کی اس منزل میں آنے والے کے دل میں لامحالہ یہ خیال گزرتا تھا کہ اس منزل کے تمام کمروں کے، سوائے ان دو خواب گاہوں کے جن میں چارلس اور اس کے ساتھیوں کا قیام رہا تھا، قصداً سجاوٹ اور فرنیچر وغیرہ سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اور ان چیزوں کو اس بڑے کمرے میں سجا دیا گیا تھا۔ جہاں بیٹھ کر چارلس اور اس کے ساتھیوں نے گزشتہ رات کھانا کھایا تھا۔

چارلس کے قدم رک گئے۔

پردہ بدستور مل رہا تھا اور سرو ہوا اس کے ٹخنوں سے پٹ رہی تھی، حالانکہ اس طرف ایک بھی کھڑکی نہ تھی اور اگر تھی بھی تو وہ بند تھی، اس کے علاوہ گزر گاہ میں

اور اب اس نے دیکھا کہ تابوت پر ڈھکن نہ تھا وہ تابوت سے چند قدم دور ایک ستون سے کمر لگا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

چارلس جہاں تھا وہیں کھڑا ہوا تھا وہاں سے وہ تابوت میں نہ دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک کافی بلند چوکی پر دھرا ہوا تھا۔ لیکن اتنا تو اسے یہاں سے بھی نظر آ رہا تھا۔ کہ سنگین تابوت کے اوپری کنارے چوٹی تھے یعنی اس چوٹی تابوت کے کنارے تھے جو اس بڑے سنگین چبوترے میں رکھا ہوا تھا یعنی مردہ پٹی اور اس مردہ پٹی پر بھی ڈھکن نہ تھا۔

چارلس آگے بڑھا۔ تجسس اسے آگے بڑھا رہا تھا لیکن مردے کا احترام اس کے قدم روک رہا تھا۔

تابوت کی چوکی کے سائے میں ایک بڑا سا صندوق رکھا ہوا تھا اس کا ڈھکن بند تھا۔ لیکن چارلس نے دیکھا کہ مقل نہ تھا لمحہ بھر کے شش و پنج کے بعد وہ جھکا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کا ڈھکن کھول دیا۔

اور الین کی بے نور پھٹی ہوئی آنکھیں چارلس کو دیکھ رہی تھیں۔

اس کا سر بڑے ہی قدرتی زاویے سے مڑا ہوا تھا۔ ابتداء میں تو چارلس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اور نہ ہی اس نے سنسنی محسوس کی پھر احساس ہوا کہ الین کے اعضاء کا تناسب بگڑا ہوا کیوں تھا۔ اور اس کا سر وہاں کیوں نہ تھا جہاں اسے ہونا چاہئے۔

الین کا کٹا ہوا سر اس کی لاش کے سینے پر بیڑی بے پروائی سے پھینک دیا گیا تھا۔ جہاں الین کی گردن کو ہونا چاہئے وہاں کچھ نہ تھا البتہ وہاں سے خون نے بہہ کر اس کے کپڑوں کو سرخ رنگ میں رنگ دیا تھا کپڑوں پر اور کئی ہوئی گردن پر اب خون جم کر سیاہ لوتھڑوں میں تبدیل ہو رہا تھا خدا جانے کیا بات تھی کہ الین کی لاش ایک دم سے سکڑ گئی تھی یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے جسم کا تمام خون بہہ جانے کی وجہ سے

سے روشنی کی ایک نسبتاً موٹی لکیر در آئی یہ روشنی اس صحن میں سے آتی ہوگی جسے اس نے گزر گاہ کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا۔۔۔۔۔ چارلس نے اندازہ لگایا۔

اس کا خیال تھا کہ نیچے کوئی مختصر سا کمرہ ہوگا اور اس کا دروازہ کچھ واڑے کے صحن میں کھلا ہوگا۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ زینہ برابر نیچے نیچے اترتا رہا یہاں تک کہ چارلس سطح زمین سے بھی نیچے آگیا۔ آخر کار اسے اپنے سامنے زینہ پر مدھم اور بھوری روشنی نظر آئی۔۔۔۔۔ اور وہ زینے کے نچلے سرے پر پہنچ گیا۔

سامنے ایک عمارت ماتہ خانہ تھا اور اس کے صحن بچ میں ایک چوکی پر تابوت رکھا ہوا تھا۔

تمہ خانے کے فرش پر قدم رکھنے سے پہلے اور آخری میڑھی پر کھڑے ہو کر تمہ خانے کا تفصیلی جائزہ لیا پھر وہ آگے بڑھا لیکن ہر قدم اٹھانے کے بعد وہ دائیں بائیں دیکھ لیتا تھا وہ چونکا تھا اور کسی بھی ناگمانی حملے کے لئے تیار تھا۔

تابوت کی چوکی پر حروف کندہ تھے چارلس اس سے چند قدم دور ٹھہر کر پڑھنے لگا۔
”کوئٹ ڈریکولا۔“

آخری آرام گاہ جس کی حاتمہ مہمان نوازی سے وہ چاروں گزشتہ رات لطف اندوز ہوئے تھے چارلس کو کوئٹ ڈریکولا کی حالت پر رحم آگیا غریب تن تھا قصر کے اس تمہ خانہ میں ابدی خند سو رہا تھا اس تمہ خانہ کو تو خانہ اپنی مقبرہ بنانا چاہئے تھا جہاں ڈریکولا کے خاندان کے دوسرے افراد بھی دفن ہوتے ہوں گے ویسے تو اس ایک تنہا تابوت کی وجہ سے یہ تمہ خانہ کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا۔

وہ ایک طرف ہٹ گیا لاشعوری طور پر وہ بڑی خاموشی اور احترام سے چل رہا تھا بالکل اسی طرح جس طرح ہم اور آپ کسی پرانے قبرستان یا مقبرے کے قریب سے گزرتے وقت خود بخود سر جھکا کر احترام سے چلنے لگ جاتے ہیں۔

مراسراہٹ۔

چارلس نے اپنے آپ کو سنبھالا اپنی قوت سمیٹی اور ایک ہاتھ بلند کر کے تابوت کا کنارہ پکڑ لیا۔ اپنے آپ کو اسی ہاتھ کے سارے اوپر اٹھایا اور گردن بڑھا کر تابوت میں دیکھا۔

تابوت میں ایک شخص اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے چت لیٹا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ لبادہ پہن رکھا تھا، جس پر خون کی سرخ رنگ کی دھاریاں تھیں اور اس کے ہاتھوں کی لمبی اور پتلی انگلیاں نہ تھیں، بلکہ وہ کسی خونخوار اور بیدرد شکاری کے پنجے تھے۔ اور اس کا چہرہ..... وہ بھی ایسا نہ تھا۔ جیسا کہ کسی مردے کا ہوتا ہے۔ یعنی نورانی اور پرسکون..... اس کا چہرہ لبوتر اور ستا ہوا تھا۔ اور اس سے بڑی سفاکی عیاں تھی یہ ابدی نیند سوئے ہوئے کسی نیک مرد کا نہیں بلکہ کسی ظالم اور سفاک چہرہ تھا۔ ایسے شخص کا جس کے سینہ میں دل نہ ہو اور جو شکار خور ہو۔ اس کے ہونٹ پتلے تھے اور بالائی ہونٹ کے دونوں کونے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے کیونکہ وہاں سے دو لالہ اور نیلے دانت، بھیڑیے کے دانتوں کے سے تھے اور باہر کو نکلتے ہوئے تھے۔ یہ ایک پر رعب چہرہ ہو سکتا تھا، شیطانیت نے اس پر اپنے پنجے اس بری طرح گاڑ رکھے تھے کہ اس تابوت میں سونے والے کا چہرہ بے حد بھیانک اور لرزہ خیز بن گیا تھا۔

مرے ہوئے گوشت اور خون کی جلی آمیز بو کے پھبکے اس شخص کے منہ سے نکل رہے تھے۔

چارلس کے قدم ڈمگائے اس کے ہاتھوں اور پیروں سے جان سرکنے لگی اور اس کی گرفت تابوت کے کنارے پر سے ڈھیلی پڑ گئی اور کنارہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

عین اس وقت تابوت والے نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔

لاش ایسی ہو گئی تھی کیوں کہ اگر ایسا ہی ہوتا تو نہ صرف ایلن کی لاش خود اس کے خون میں لت پت ہوتی بلکہ صندوق بھی خون سے بھر گیا ہوتا لیکن ایسا نہ تھا ایلن کے لباس پر اور صندوق کی دیواروں پر خون کے چند موٹے قطرے سے تھے اور بس۔

چارلس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبایا، منہ سختی سے بند کیا۔ اور کمر میں سے دھرا ہو گیا۔ وہ تھے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی سلاخیں تن گئی تھیں۔

آخر کار وہ اپنی تھے روکنے میں کامیاب ہو گیا، وہ بری طرح سے ہانپ رہا تھا۔ اور اس کے ماتھے سے ٹھنڈا پھیند بہہ کر اس کی آنکھوں میں داخل ہو رہا اور جلن پیدا کر رہا تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے ایک ہاتھ بڑھایا اور دھڑے صندوق کا ڈھکن بند کر دیا۔

چارلس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا، لیکن ٹانگوں نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس نے پہلا ہی قدم اٹھایا تھا کہ وہ لڑکھڑا گیا، جھکا اور دونوں ہاتھ بڑھا کر تابوت کی چوکی کا سنارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے دماغ میں خشک صحرائی گولے ناچ رہے تھے اور تابوت کی چوکی پر کندہ حروف اس کی نظر کے سامنے ناچ رہے تھے۔

اور عین اسی وقت تابوت میں 'اور چارلس کے جھکے ہوئے سر کے عین قریب' کسی چیز نے حرکت کی،

چارلس جس حالت میں تھا اسی حالت میں بت بن گیا۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ تابوت میں کسی چیز نے حرکت کی تھی، یہ ناممکن تھا یہ شاید اس کا وہم تھا۔ یہ آواز شاید اس کے دماغ میں پیدا ہوئی تھی یا شاید اس کے کان بج رہے تھے۔

وہ آواز پھر سنائی دی کسی کے پہلو بدلتے کی مدہم آواز۔ کسی کے لباس کی ہلکی سی

باب-۶

بست سی چنگاریاں بے شمار جگنوؤں کی طرح ہلکے سے چٹائے کی آواز کے ساتھ جھونپڑی کی فضا میں بکھر گئیں اور لکڑیوں نے کڑوا اور زرد رنگ کا دھواں اٹھایا۔ جو ڈانکا کی آنکھوں اور منہ میں جاگھسا اس کی آنکھوں میں سے جلن کے ساتھ پانی بہہ آیا اور وہ کھانسنے لگی۔

وہ جھونپڑی کے ایک کونے میں پچھلے کئی منٹوں سے آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ آگ اور روشنی ہو تو اس کی ڈھارس بندھائے لیکن لکڑیاں گیلی تھیں اور جھونپڑی میں ہوا نہ آ رہی تھی کہ انہیں پٹکھا جھل کر بھڑکا دیتی۔ ڈانکا تھک کر اکڑوں بیٹھ گئی۔

باہر دن ختم ہو رہا تھا اور روشنی غائب ہو رہی تھی۔ جھونپڑی میں ابھی سے اندھیرا گھس آیا تھا اور ننھے سے الاؤ سے اٹھتا ہوا دھواں اس اندھیرے کو اور بھی گاڑھا کر رہا تھا۔ فضا سرد ہو چلی تھی لیکن ڈانکا کو گرمی کی اتنی ضرورت نہ تھی۔ جتنی روشنی کی سردی تو بہر حال وہ برداشت کر سکتی تھی، لیکن اندھیرے کو نہیں کیونکہ جیسے جیسے اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اس کے دل میں خوف اترتا جا رہا تھا وہ اندھیرے سے کبھی خوف زدہ نہ ہوئی تھی۔ لیکن یہاں خدا جانے کیا بات تھی کہ وہ اندھیرے سے ڈرنے لگی تھی، اس بچے کی طرح جسے اس کی ماں نے شرارت کی سزا دینے کے لئے یا غلطی سے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا ہو، ڈانکا کا خوف بڑھتا ہی جا رہا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اندھیرا اترتے ہی کچھ ہوگا۔ شاید تاریکی کے دیوتا اور بلائیں نکل کر اسے نگل لیں گی۔

وہ ایک بار پھر بچھتی ہوئی آگ پر جھک گئی کہ پھونکیں مار مار کر اسے بھڑکا دے

کوٹ ڈر کیولا بیدار ہو چکا تھا۔ اور اب وہ اٹھ رہا تھا۔ پاگل کتے کی سی ایک بھیاںک جھج سے نہ جانے کی فضا لرز اٹھی یہ چارلس تھا۔ جو چیخا تھا۔ دفعت اس کے ہر گھٹنوں میں سے کٹ گئے اور وہ دھڑام سے گرا۔ لیکن پھر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں فرش پر ٹیک کر جیسے بڑی تکلیف سے اٹھ کر گھٹنوں کے بیٹھ گیا۔ پھر دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر بڑی کوشش کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ اور لڑکھڑاتے قدموں سے زمین کی طرف بھاگا۔

اور اب وہ شرایوں کی طرح جھومتا اور ٹھوکریں کھاتا چکر دار زمین چڑھ رہا تھا۔



طرف دیکھا، ایک طویل القامت انسانی سایہ دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔
ڈانکا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

کیونے کہا۔ ”خاتون! ایک بار پھر میں نے آپ کو خوفزدہ کر دیا جس کی میں معافی
چاہتا ہوں۔“
”کیونے تم؟“

”جی ہاں۔ یہ میں ہی ہوں۔“
”تم۔۔۔ تم۔۔۔ یہاں کیا لینے آئے ہو؟“
”آپ کو لینے آیا ہوں خاتون“
”مجھے۔۔۔“

”جی ہاں، آپ کے شوہر نے مجھے بھیجا ہے۔“
”چارلس نے؟“

جی ہاں۔ انہوں نے مجھے بتکھی لے کر یہاں بھیجا ہے کہ آپ کو ان کے پاس پہنچا
دوں۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ۔۔۔۔۔“
”آپ کے شوہر سب کچھ سمجھا دیں گے۔“

کیونے ایک بار پھر وہی گزشتہ رات والا کلیو تھا۔ فرماں بردار اور مہمانوں کا احترام
کرنے والا۔ وہ جھونپڑی کا ٹوٹا ہوا کواڑ اس طرح پکڑے کھڑا تھا جیسے یہ کسی آرام دہ
بیرونی کمرے کا دروازہ ہو جس کے دوسری طرف ایک وسیع و عریض کمرے میں
پر رعب اور بارسوخ ہستی ڈانکا کی منتظر ہو۔

”لیکن ایلیں کہاں ہے؟“ ڈانکا نے ایک دم سے پوچھا۔ ”کہاں گیا وہ اور اس کی
بیوی بھی؟“

کچھ تو روشنی ہو۔ اس کے دل سے ذرا سا خوف دور ہو۔

لیکن ابھی وہ جھکی ہی تھی کہ دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی وہ اٹھ
کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور وہاں جالوں کی جھالیں لٹک رہی تھیں۔ اس
نے ہاتھ بڑھا کر جالے گھسٹ لئے اور پھر کھڑکی کے شیشوں پر ہتھیلی پھیر کر اس پر سے
چٹنائی کے دھبے مٹائے اور چوراہے کی طرف دیکھا۔

ٹاپوں کی آواز زیادہ سے زیادہ قریب آئی جا رہی تھی۔۔۔ اور پھر اسے وہ نظر
آگئے۔ وہی کالے گھوڑے جو کبھی کو کھینچ رہے تھے گھوڑے وہی تھے جو گزشتہ رات
آئے تھے تبھی وہی تھی جس میں گزشتہ رات وہ چاروں سوار ہوئے تھے اور جو انہیں
تھریک لے گئی تھی۔

ڈانکا نے کھڑکی کے شیشے سے اپنی ناک لگا دی اور غور سے دیکھنے لگی۔

تبھی آگے بڑھی، اس کی زلفاں کم ہونے لگی اور وہ چوراہے پر پہنچ کر رک گئی
گھوڑوں نے ایک جھرمجری لے کر اپنے بدن جھٹکے، سر ہلائے اور بے حرکت کھڑے
ہو گئے، ڈانکا ایک طرف کھسک کر کھڑکی کے کنارے پر کھڑی ہو گئی اس زاویے سے
اسے پوری تبھی نظر آتی تھی۔

تبھی پر کوئی کوچوان بیٹھا ہوا نہ تھا۔

گھوڑے آپس میں تھو تھنٹنک رگڑ رہے تھے اور زمین پر ٹاپیں مار رہے تھے وہ
خاموش کھڑے تھے اور تبھی بھی خنجر کھڑی تھی، اس کے آتے ہی فضاء پر ہول بن گئی
تھی۔ خاموشی اور بھی گہری ہو گئی تھی جیسے عناصر بھی دم بخود اور سسے ہوئے ہوں۔

ڈانکا کے دل میں ایک عجیب طرح کا خوف بڑھنے اور پھیلنے لگا اور پھر وہ ناقابل
برداشت بے چینی میں تبدیل ہو گیا وہ کھڑکی کے قریب سے ہٹ آئی۔

فوراً ہی ہلکی سی آواز کے ساتھ جھونپڑی کا دروازہ کھلا ڈانکا نے چونک کر اس

”میں نے عرض کیا نا خاتون کہ آپ کے شوہر سب کچھ سمجھا دیں گے“ اور وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

ڈانکا نے سوچا کہ گزشتہ رات کلیو کی مہماں نوازی کسی خاص مقصد کے تحت تھی، اس کا سلوک جو بظاہر بڑا اطمینان بخش اور قابل تعریف تھا، دراصل بڑا ہی عیارانہ تھا اور اس کی شائستگی اور خوش خلقی بڑی ہی گستاخانہ تھی اس شخص پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اسے احساس تھا کہ اسے کہیں نہیں جانا ہے۔ اسے وہیں رہنا ہے، جہاں وہ اس وقت ہے لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ چارلس قصر میں تھا۔ اور اس کلیو کو بھیج دیا تھا کہ وہ ڈانکا کو لے آئے اور۔۔۔۔۔

”خاتون! پہلیے۔ آپ کے شوہر خنجر ہیں۔“ کلیو نے کہا۔

اور وہ بے اختیار دروازے کی طرف بڑھی جیسے وہ اپنی مرضی کی مالک نہ رہی ہو۔ کلیو ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور جب ڈانکا اس کے قریب سے گزری تو وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔

”وہ تبھی میں سوار ہو گئی۔ کلیو خاموشی سے کوچوان کی جگہ جا بیٹھا اور اس نے لگائیں اپنے ہاتھوں میں لے کر گھوڑوں کا رخ موڑ دیا اور ایک بار پھر تبھی اس راستہ پر چل پڑی جو قصر ڈریکولا کی طرف جاتا تھا، ڈانکا کو کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ اس جنگل میں اور پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوئے قصر ڈریکولا میں کوئی خاص بات تھی۔ کوئی آسیب تھا۔

تبھی بے حد عمدہ اور آرام دہ تھی اور اس دفعہ اس کی رفتار بھی مناسب تھی گزشتہ رات کی بہ نسبت بے حد کم رفتار تھی۔ ڈانکا کو بڑی عزت و احترام سے اسی گھر کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ جہاں صرف چوبیس گھنٹوں پہلے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا گیا تھا۔

خندق کے پل پر کے تختے گھوڑوں کی ٹاپوں اور پھر تبھی کے پیوں کی کھڑکڑاہٹ سے بچ اٹھے، اور یہ آواز قصر کی محرابوں میں گھس کر اور آواز بازگشت پیدا کر کے ڈوب گئی۔ تبھی صحن میں پہنچ چکی تھی تبھی ابھی پوری طرح رکی بھی نہ تھی کہ کلیو کوچوان کی نشست پر سے نیچے کود آیا اور اس سے پہلے کہ ڈانکا ”اتروں یا نہ اتروں“ کا فیصلہ کر پاتی، وہ تبھی کا دروازہ اس کے لئے کھولے منسوب کھڑا تھا۔

”اس طرف خاتون۔“ اس نے کہا۔

اور پھر کمر میں سے اس حد تک جھک گیا کہ ڈانکا کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کلیو اس کا مذاق اڑا رہا ہو یا اسے بتا رہا ہو۔

بہر حال وہ تبھی میں سے اتر آئی اور قصر کے صدر دروازے کی طرف چلی، کلیو اس کے پیچھے تھا لیکن جب ڈانکا نے دروازہ کھولنے کے لئے اپنا ہاتھ لبا کیا تو کلیو اک دم سے اچھل کر اور حیرت انگیز پھرتی سے آگے بڑھ آیا اور اس سے پہلے کہ ڈانکا کی انگلیوں کی پوریں کواڑ کو چھوتیں کلیو اس کے لئے دروازہ کھول چکا تھا۔

ڈانکا خاموشی سے آگے بڑھی اور دروازے میں سے گزر کر قصر کے بڑے کمرے میں داخل ہو گئی۔ فوراً ہی دروازہ بونے زور سے بند کر دیا گیا اس کے بند ہونے کی آواز سے ڈانکا کا دل قلا بازی سی کھا گیا اور وہ کلیو کو سرزنش کرنے کے لئے اس کی طرف گھوم گئی۔

لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ کلیو قصر کے باہر ہی رہ گیا تھا۔

ڈانکا ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ دروازے پر جا پڑی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کواڑ پر لگا ہوا پرانی طرز کا دست پکڑ لیا اور اپنے نازک جسم کی پوری طاقت صرف کر کے اسے کھینچا۔ دروازہ مضبوطی سے بند تھا چنانچہ وہ نہ کھلا۔

”کب سے ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔“ ایک آواز نے کہا۔

یہ پرسکون آواز تھی۔ لہجہ ایسا تھا جیسے بچوں کو بلانے اور پھسلانے کے لئے بزرگ استعمال کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ یہ آواز ڈانکا کے لئے انجاناً نہ تھی۔

”ہم سوچ رہے تھے کہ تم آؤ گی بھی یا نہیں۔ بہت انتظار کروایا۔“ اس آواز نے کہا۔

ڈانکا آواز کے طرف گھوم گئی۔

زینے کے قریب کوئی اور نہیں بلکہ خود ہیلن کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے چمکدار ریٹھی بال اس بری طرح سے بکھرے ہوئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا اسے ابھی چند منٹوں پہلے ہی گہری نیند سے جبراً بیدار کیا گیا ہو۔ ہیلن فطرتاً ہی خور و سخت قسم کی عورت تھی۔ لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ اس وقت اس کے یہ جذبات اس کے بشرے سے اس طرح نمایاں تھے کہ اس کا چہرہ بگڑ کر بھیانک بن گیا تھا اور وہ بڑی ہی بیدار اور ظالم نظر آتی تھی۔

لیکن اس کی آواز..... وہ بڑی معصوم تھی اور پھسلانے والی۔
”ڈانکا! بڑی راہ دکھائی تم نے۔“ وہ بولی۔

ڈانکا نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ اس کی ساری پریشانی اور خوف دھنسا دور ہو گیا۔ یانیک اس کے تھے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور وہ عجیب طرح کی نقابت محسوس کرنے لگی۔ تاہم اس کی جی چاہ رہا تھا۔ کہ وہ خوب ہنسے اور وہ بیوقوفوں کی طرح ہنس کر ہیلن کی طرف بڑھی۔

”چارلس کہاں ہے؟“ اس نے کہا بے حد مشکور اور پریشان تھے ہم۔ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ.....“

ڈانکا جملہ پورا نہ کر سکی۔ اس کی آواز حلق میں ہی ڈوب کر رہ گئی۔

ہیلن بیٹھ سے مغرور اور خود پسند عورت تھی اور اکثر دفعہ اس کے بشرے سے اسکول کی اساتذہ کی سی حکمت ٹپکنے لگتی تھی ڈانکا نے اکثر ہیلن کے بشرے پر یہ حکمت اور کرختگی دیکھی تھی لیکن اس وقت اس کے بشرے سے جو جذبات عیاں تھے وہ بالکل نئے تھے۔ کم سے کم ڈانکا ان سے واقف نہ تھی۔ کینہ اس کے چہرے پر جیسے نمودار ہو کر رہ گیا تھا اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ عیارانہ چمک جس سے شیطانیت جھانک رہی تھی ہو اس ناگن کی طرح نظر آ رہی تھی جو پھن پھیلا چکی ہو اور کوئی دم میں ڈسنے والی ہو۔

”معاملہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ ڈانکا نے کہا۔ ”کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔“

”کچھ..... ہیلن! ایلن کہاں ہے؟“

”گھبراؤ نہیں۔ آؤ۔ میرے قریب آؤ۔ میری اچھی بہن آؤ۔“

اور ہیلن نے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ڈانکا ایک دم سے پیچھے ہٹ گئی۔

”چارلس کہاں ہے؟“ ڈانکا نے پوچھا۔

”چارلس! آ۔ ہاں۔۔۔ اب اس سے تمہیں کیا واسطہ؟“

ڈانکا نے کوشش کی کہ اپنے بشرے سے ان جذبات کا اظہار نہ ہونے دے جنہوں نے اس کی دل میں ایک طوفان اٹھا رکھا تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ جو اس کے سامنے کھڑی ہوئی ہے ایلن کی بیوی نہیں ہے۔ وہ ہیلن نہ تھی جس سے ڈانکا واقف تھی۔ وہ دھنسا بدل گئی تھی..... وہ..... وہ کچھ اور بن گئی تھی چنانچہ اس کے قریب جانا خطرناک تھا اس کمرے میں ٹھہرنا خطرناک تھا۔

ڈانکا نے نظروں سے اپنا اور ہیلن کا درمیانی فاصلہ ہٹا اور پھر پلٹ کر بھاگ پڑی۔ ایک بھیانک اور وحشت انگیز قہقہہ کمرے میں گونج گیا یہ ہیلن تھی جو دیوانوں

کی طرح قہقہے لگا رہی تھی اور اس کے یہ کھوکھلے اور غیر ارضی قہقہے ڈانٹا کا خون منہ سے
کر رہے تھے۔

دروازہ کھلا تھا، ڈانٹا اس کی طرف یوں بھاگی جیسے اس کے پیچھے دونوں کی عنقریب
لگ گئی ہوں وہ دروازے کے قریب پہنچ گئی اور بس ایک کالے سائے نے اس کا
راستہ روک لیا ایک طویل القامت اور دھلا پتلا شخص جس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا
جس پر سرخ دھاریاں تھیں بڑی پھرتی مگر ایک رقصہ کی سی اداسے یا اس نازک
مزاج قاتل کی طرح جو اپنا شکار منتخب کر رہا ہو اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔
ہیلن بدستور قہقہے لگا رہی تھی۔

ڈانٹا کا راستہ روک کر کھڑے ہوئے شخص کا لباس اس کے پیچھے یوں اڑ رہا تھا کہ
وہ کسی بڑی سی چمکاوڑ کے دو بازو معلوم ہوتے تھے دوپٹے اور لائے ہاتھ ڈانٹا کی طرف
بڑے اور شکاری پرندے کے سے پنچوں نے اسے دبوچ لیا۔

ڈانٹا کو دبوچنے والے کا چہرہ کسی مردے کا چہرہ تھا سا ہوا بے رنگ اور کرخت اور
ڈانٹا اس چہرے پر اندھا دھند گھونٹے چلا رہی تھی لیکن ان گھونٹوں کا اس کا میاب
شکاری پر کچھ بھی اثر نہ ہوا، حتیٰ کہ اس نے پلک تک نہ جھپکی اور اس کی گرفت ذرا
بھی ڈھیلی نہ ہوئی۔ اس نے ڈانٹا کو بڑی آسانی سے گھسیٹ کر قدرے اوپر اٹھالیا۔
اس کے پیر فرش سے اوپر اٹھ گئے اور اب وہ ڈانٹا کو کچھ گھسیٹتے ہوئے اور کچھ
اٹھائے ہوئے زینے کی طرف چلا۔

”ڈرکولا!“ چوڑو اس لڑکی کو۔“

اور ڈانٹا خوشی سے رو پڑی۔ اس کے منہ سے ہلکی نکل گئی، کیونکہ یہ کسی اور کی
نہیں بلکہ اس کے اپنے چارلس کی آواز تھی۔ وہ بدقت تمام ایک طرف گھوم گئی کہ
اپنے چارلس کو دیکھ سکے۔

ہیلن نے جس فوری طور سے ہنسا شروع کیا تھا اس فوری طور سے وہ خاموش
ہو گئی اور پہلو کے اس دروازہ کی طرف بھاگی جس دروازے سے چارلس نکل آیا تھا۔
اس نے چارلس کے قریب پہنچ کر اس کا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔

”چارلس! میرے بھائی!“ لاؤ میں تمہیں چوم لوں۔“ ہیلن نے کہا۔

چارلس ہیلن کی طرف نہیں بلکہ اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک
قدم آگے بڑھایا۔ تو ہیلن اس سے لپٹ گئی۔ ادھر ڈرکولا ڈانٹا کو اپنی گرفت میں لئے
تھا اور خود ڈانٹا اپنی آپ کو چھڑانے کے لئے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔

ہیلن نے اپنا سر چارلس کے ماتھے یا رخسار کی طرف جھکانے کے بجائے یہ کیا کہ
اپنی گردن ذرا ٹیڑھی کر لی اور اب اس کا سر آہستہ آہستہ چارلس کی گردن پر جھکنے لگا۔
لیکن اس کا یہ عمل کچھ ایسا عیاریانہ اور حیوانی سا تھا کہ چارلس ایک دم سے چونکا اور
اس نے گھوم کر ہیلن کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ اس کے بشرے سے عجیب
طرح کی خونخواری عیاں تھی اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ کھل رہے تھے اور اس
کے دو ٹکیلے اور لائے دانت نمودار ہو رہے تھے۔

کچھ اور تو چارلس کی سمجھ میں نہ آیا۔ البتہ اس نے ہیلن کو ایک دھکا دے دیا وہ
لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی اور پھر فرش پر گری۔

ادھر ڈانٹا نے ایک آخری کوشش کی اور زرد مار کر ڈرکولا کی گرفت سے آزاد
ہو گئی۔ موصلاً ذکر کرنے اپنے لائے اور پتلے ہاتھ اس کی طرف چلائے تو وہ چارلس کی
طرف بھاگی۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ اپنے شوہر کے سینے سے لگ جائے اور اس کی
بانہوں میں اس وقت تک سمٹی رہے جب تک کہ یہ بھیانک خواب پریشان غائب نہ
ہو جاتا، کیونکہ جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ ڈانٹا کے لئے حقیقت سے زیادہ ایک خواب پریشان
ہی تھا، لیکن بجائے اس کے کہ چارلس اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتا۔ اس نے ڈانٹا

کو پکڑ کر اپنے پیچھے ڈھکیل دیا اور ڈریکولا کے چہرے پر اپنی نظریں بدستور جمائے رکھیں۔

”ڈانٹا فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔“ چارلس نے کہا۔
”نہیں۔“

• ”جاؤ۔“ کبھی میں سوار ہو کر بھاگ نکلو۔“

”نہیں۔ میں تم کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

”جیسا میں کہتا ہوں، ایسا ہی کرو۔ ڈانٹا! جاؤ۔“

ڈریکولا ان کی طرف بڑھا۔ وہ ذرا بھی پریشان اور گھبرایا ہوا نہ تھا اس کے برخلاف وہ مطمئن تھا۔ اس بلی کی طرح جس نے دو چوہے دبوچ رکھے ہوں، وہ اجساد سے کانپ رہا تھا اگر ایک شکار فرار ہو گیا تو دوسرا نہ بچ سکے گا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔ بشرطیکہ ہم اسے مسکراہٹ کہہ سکیں کیونکہ اس کے ہونٹوں کا یہ کھنچاؤ بڑا ہی لرزہ خیز تھا۔

ڈانٹا جانے کے لئے تیار نہ تھی، لیکن چارلس نے اپنا ایک ہاتھ خاموشی سے دروازہ کی طرف اٹھا دیا۔ اور ڈانٹا بڑی فرمانبرداری سے دروازے کی طرف پلٹ گئی اس کے اور دروازے کے درمیان اس بڑے کمرے کی وسعت تھی جو ڈانٹا کو ایک وسیع اور افقی تک پھیلے ہوئے میدان کی طرح معلوم ہو رہی تھی اور اس وسعت میں کہیں کوئی جائے پناہ نہ تھی۔
وہ دروازے کی طرف بھاگی۔

فوراً ہی ہیلن کا خون منجمد کر دینے والا قلعہ گونج گیا ہیلن نے ڈانٹا کا ایک بازو پکڑ لیا۔ آہنی گرفت تھی اس کی، اس نے ڈانٹا کو بڑی بیدردی سے پیچھے کی طرف دھکیلا اور دیوار تک دھکیلتی چلی گئی اور اب ڈانٹا کی پیٹھ سے دیوار سے لگ چکی تھی اور

ہیلن اسے دبوچے ہوئے تھی۔

اور ڈریکولا چارلس کے قریب پہنچ گیا۔

چارلس نے اس کی طرف گھونٹہ چلا دیا۔ ڈریکولا نے ایک طرف ہٹ کر اس کا وار بچایا اور پھر اپنا سر جھکا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے چارلس کی کمر پکڑی اور اسے بڑی آسانی سے، جیسے وہ ایک ڈیڑھ برس کا بچہ ہو اور اٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ چارلس کچھ کر سکتا ڈریکولا نے اسے اچھال کر پھینک دیا۔ چارلس ہوا میں حیرتا ہوا سامنے والی دیوار سے بڑی زور سے ٹکرا گیا اس کا بھیجاہل گیا، نظر کے سامنے رنگ برنگ پیلے سے ناچ گئے اور پھر وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ڈریکولا کے منہ سے بھڑپنے کی غراہٹ کی سی آواز نکلی اور وہ چارلس کی طرف بڑھا۔

چارلس نے اپنا سر جھکا، دونوں ہاتھ گھٹنوں پر ٹیکے اور دیوار سے پیٹھ لگائے بلکہ یوں کہیں کہ دیوار پر پیٹھ گھسیٹتا آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور کسی ہتھیار کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

چند فٹ دور ایک رنگ آلود تلوار پڑی ہوئی تھی ایک سیکنڈ پہلے یہ تلوار دیوار پر تکی ہوئی تھی لیکن چارلس دیوار سے اس زور سے ٹکرایا تھا کہ وہ کیل میں سے نکل کر فرش پر آگری تھی، چارلس اپنے پہلو پر لڑھک گیا اور ہاتھ بڑھا کر تلوار کا دستہ پکڑ لیا، وہ جلدی سے اٹھا اپنی ٹانگیں ذرا چوڑی کر لیں کہ توازن برقرار رہے اور اب وہ خطر کھڑا تھا تلوار کی نوک آگے بڑھتے ہوئے ڈریکولا کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

ڈانٹا ہیلن کی گرفت سے آزاد ہونے کی دیوانہ وار کوشش کر رہی تھی لیکن ہیلن اسے برابر دبوچے جاری تھی اور پھر دونوں عورتیں لمبے بھر بعد چارلس اور ڈریکولا کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

دو دونوں کی ٹکر ہونے والی تھی۔

چارلس نے کچکا کوار ڈریکولا کی طرف جھونک دی سرخ دھاریوں والا کالہ
کسی بڑے سے پتھر کے باؤنوں کی طرح پڑ پڑایا۔ اور اس نے فضا میں ایک کالا
بھنور سا پیدا کر دیا۔ ڈریکولا وار بچا گیا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ وہ کوار کا پھل بھی
اپنے ہاتھ میں پکڑ چکا تھا۔ چارلس نے کوار کو گھما کر گھینے کی کوشش کی، تاکہ گرفت
سے چھڑا کر دوسرا اور بھرپور وار کر دے۔



چارلس زور آزمائی کر رہا تھا اور کوار ڈریکولا کی ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کر رہا
تھا۔ کوار کا پھل ڈریکولا کے ہاتھ میں گھوم رہا تھا اور اس کی 'ڈریکولا کی' انگلیوں کے
درمیان سے خون ٹپک رہا تھا، کوار کی دھار ڈریکولا کی ہتھیلی میں ہڈی تک پہنچنے کے
لئے راستہ بنا رہی تھی لیکن خود ڈریکولا مسکرا رہا تھا۔

اس نے ایک زور کا جھٹکا دیا اور کوار چارلس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔
ڈریکولا کے منہ سے ایک بار پھر غراہٹ کی آواز نکلی اس نے کوار دونوں ہاتھوں
میں پکڑ کر اوپر اٹھائی اور پھر "تڑاخ" سے یوں توڑ دی جیسے وہ فولادی کوار نہیں بلکہ
خٹک مٹی ہو۔ اس نے کوار کے دونوں ٹکڑے اپنے قدموں میں پھینک دیئے اور
اب اس نے بڑے یقین سے، بڑے اطمینان سے اور قہمندانہ غراہٹ کے ساتھ اپنے
دونوں ہاتھ چارلس کی طرف بڑھائے اور دوسرے ہی لمحے اس کی گردن ڈریکولا کے
بیدار اور خونخوار پنجوں میں پھنسی ہوئی تھی ڈریکولا اس کا گلا دبائے لگا۔

چارلس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور جھک گیا اور آہستہ آہستہ بیٹھنے لگا لول تو
اس لئے کہ ڈریکولا کا تمام بوجھ اس پر پڑ رہا تھا اور دم اس لئے کہ اس کا دم گھٹ رہا
تھا اور وہ مر رہا تھا۔

ڈانکا کی ٹٹک شکاف جیج سے قمر کی بے حس دیواریں کانپ گئیں وہ جیلن کی

آجائے۔ لیکن وہ ہوا میں اوہرا اوہرا کر رہ جاتے تھے۔

ڈریکولا مسکرا رہا تھا اس کے ہونٹ دانتوں پر کھینچ گئے تھے۔ آنکھوں میں سرخ
موٹے ڈورے پیدا ہو گئے تھے۔ اور وہ اس بلی کی طرح ہولے ہولے غرا رہا تھا جو اپنے
ڈکار سے کھیل رہی ہو۔

”چارلس۔۔۔ صلیب“ ڈانٹا چیخی۔

ڈریکولا چارلس کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

”چارلس۔ صلیب بناؤ۔

اور وہ ڈریکولا اور چارلس کی طرف بڑھی لیکن چارلس نے نہ صرف اس کی آواز
سن لی تھی بلکہ وہ اس کا مطلب بھی سمجھ گیا تھا وہ ایک طرف اس طرح جھک گیا کہ
اس کا پورا بوجھ ڈریکولا کے ہاتھوں پر آ پڑا۔ کچھ جھک کر اور کچھ لٹک کا اس نے فرش
پر سے ٹکوار کے دونوں ٹکڑے اٹھائے جو وہاں ڈریکولا نے پھینکے تھے اس کی آنکھوں
کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا۔ اعضا بے جان سے ہو چلے تھے اور
اس کے باوجود اس نے ٹکوار کے ایک ٹکڑے پر دو سرا ٹکڑا اس طرح رکھ دیا کہ ان دو
ٹکڑوں نے صلیب کی ایک بے ڈھنگی سی شکل بنا دی۔

اس کے بعد چارلس بدقت تمام سیدھا ہوا اور اپنی بے جان ہوتی ہوئی ٹانگوں پر
اپنے جسم کا بوجھ سنبھال کر اس نے صلیب آہستہ آہستہ بلند کی۔

اور اب صلیب عین ڈریکولا کے سامنے تھی۔

ڈریکولا کی فتمندانہ اور خواب ناک سی مسکراہٹ یکایک غصے کی غراہٹ میں
تبدیل ہو گئی۔ اس نے چارلس کو چھوڑ دیا اور گھبرا کر بے اختیار کئی قدم پیچھے ہٹ
گیا۔

ڈریکولا غصے اور احساس شکست سے پھنکار رہا تھا۔

گرفت سے آزاد ہونے کے لئے کسی پاگل عورت کی طرح جدوجہد کر رہی تھی۔ ہیلن
اور ڈانٹا آپس میں ستم گتھا تھیں۔ یونہی کشتی کرتے اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی
کوشش کرتیں ہوتیں وہ دونوں کمرے کے عین بیچ میں آگئیں اس جدوجہد میں ڈانٹا
کے لباس کی ایک آستین پھٹ گئی اور گربان کے بن کچھ ٹوٹ گئے اور کچھ کل گئے
اور اس کا سینہ چھاتیوں کی اوپری گولائیوں تک عریاں ہو گیا چنانچہ کھلے ہوئے گربان
میں سے وہ سیاہ ریشمی دھاگا کے نچلے سرے سے ایک چھوٹی اور سنہری صلیب لٹک
رہی تھی۔ یہ صلیب اور اس کی مرحوم ماں کی نشانی تھی۔ دھاگے کے سرے پر جھولتی
ہوئی صلیب گھڑی بھر کے لئے ہیلن کے ہاتھ سے چھو گئی۔

ایک بھیاںک خون منجمد کر دینے والی چیخ مچ گئی اس دفعہ یہ ہیلن تھی جو چیخی تھی
اس نے ڈانٹا کو گھبرا کر چھوڑ دیا اور لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ہیلن کی آنکھیں
جیسے تکلیف سے پھٹ گئی تھیں، اس کا منہ کھلا تھا اور وہ بری طرح سے ہانپ رہی
تھی۔

ڈانٹا بھی لڑکھڑا گئی وہ بھی منہ کھولے کمرے کمرے سانس لے رہی تھی اور یہ
سوچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ ایک دم سے کیا ہوا۔ کہ ہیلن یوں چیخ پڑی جیسے
کسی نے اس کی ہتھیلی پر دھککا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔؟

اس نے کیوں گھبرا کر ڈانٹا کو چھوڑ دیا؟ اور پھر اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔
اس نے وہ چھوٹی سی سنہری صلیب دو انگلیوں میں پکڑ کر اوپر اٹھائی۔

فورا ہیلن خوف سے غرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

”چارلس۔!“ ڈانٹا نے کہا۔

چارلس کی آنکھیں حلقوں میں سے نکل پڑی تھیں اس کے دونوں ہاتھ تقریباً
بے جان سے ہوا میں بل رہے تھے کہ شاید ان کی گرفت میں کوئی چیز، کوئی ہتھیار

اس نے لگائیں پکڑیں اور گھوڑوں پر بے تحاشہ چابک برسا دیئے۔
”خ-خ-خ۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔“

اس نے لگاموں کو ایک جھٹکا دے کر گھوڑوں کو لٹکار دیا اور وہ بڑے میکائی اور
جلی طور پر مرکز خندق کے پل کی طرف چل پڑے۔
ڈانکا نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔

قصر کے دروازے میں دو سائے کھڑے ہاتھ ہلا رہے تھے اور چیخ و تاب کھا رہے
تھے۔ یہ ڈریکولا اور ہیلن تھیں اور پھر لمحے بھر کے لئے وہ دونوں سائے گڈا ہو گئے
دونوں مل کر ایک ہو گئے ڈانکا نے دیکھا کہ ہیلن نے اپنی بانیں ڈریکولا کی گردن میں
پٹنا دی تھیں۔ خود اس سے لپٹ گئی اور اس نے کوشش کر کے ڈریکولا کا سر اپنی اوپر
جھکایا۔ خدا جانے کیا کر رہے تھے۔ وہ دونوں؟ کیا وہ ایک دوسرے کو چوم رہے تھے؟
لیکن ڈریکولا کا سر ہیلن کے چہرے پر نہیں بلکہ اس کی گردن پر جھکا ہوا تھا۔

دونوں سائے الگ ہو گئے اور ایک سایہ آگے بڑھ کر صحن میں آگیا۔ یہ ڈریکولا تھا
جو کبھی کی طرف اپنے گھونے ہلا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ دائیں بائیں
پھیلا دیئے۔ اس کا لبادہ چمکادڑ کے بازوؤں کی طرح پھیل گیا۔ ڈریکولا اپنے دونوں ہاتھ
تیزی سے یوں ہلانے لگا جیسے وہ اڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور پھر ڈانکا نے دیکھا
..... آنکھیں مل کر دیکھا کہ وہ چمکادڑ میں تبدیل ہو رہا تھا وہ اوپر اٹھا کچھ
چمکادڑ اور کچھ انسان چند فٹ اوپر اٹھ کر وہ گرا اور زمین پر لوٹنے لگا اس نے
پھر اڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا وہ لوٹ پوٹ کر اٹھا کھڑا ہوا وہ
پھر ڈریکولا تھا اور نہایت ہی غصے کے عالم میں وہ کئی قدم آگے بڑھ آیا تھا دور ہوتی ہوئی
کبھی کی طرف۔

کبھی دور نکل آئی اور ڈریکولا کو اندھیرے نے نگل لیا۔

ڈریکولا کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی چارلس فرش پر ڈھے گیا۔ ڈانکا دوڑ کر اس
کے قریب پہنچی اور اس نے سارا دے کر اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ چارلس تھاہت سے
ڈانکا کے بازوؤں میں جھول رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کے حواس بجا تھے اور اس نے
تکوار کے ٹکڑوں کی بنی ہوئی صلیب اپنے سامنے اٹھا رکھی تھی۔

چارلس اور ڈانکا اگلے قدموں اور قدم بہ قدم دروازے کی طرف ہٹنے لگے۔
ڈریکولا اور ہیلن ان کے سامنے کھڑے ہوئے تھے، شکست خوردہ سے اور سسے ہوئے۔
ان دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ بار بار وہ دونوں سر اٹھا کر دروازے کی طرف ہٹے
ہوئے چارلس اور ڈانکا کی طرف دیکھ لیتے اور پھر فوراً ہی نظریں جھکا لیتے جیسے تیز
روشنی ان کی آنکھوں میں چھ رہی ہو۔ دونوں ہولے ہولے کراہ رہے تھے۔

ڈانکا نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا کہ معلوم کرے کہ دروازہ ابھی اور کتنی دور تھا۔
دروازہ کھلا تھا لیکن کیونکہ دروازے میں سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے
ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔

ڈانکا نے چیخ کر چارلس کو ایک طرف کھیٹ لیا۔

کلیو چاقو بلند کر کے کمرے میں کھس آیا۔ چارلس نے تکوار سے بنائی ہوئی صلیب
توڑ دی اور اس کے دستے والے ٹکڑے سے کلیو پروار کر دیا۔ وار اس کی کٹپٹی پر پڑا۔
چٹاخ کی سی ہلکی سی آواز ہوئی، کلیو کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر آواز کے ساتھ سنگین
فرش پر گرا اور خود کلیو ایک لمحے تک جھومنے کے بعد ڈھے گیا۔ چارلس نے ڈانکا کا
ہاتھ پکڑا اور دونوں بھاگ کر صحن میں آگئے۔

رات کے اندھیرے اور مہیب سایوں کے پس منظر میں ایک اور زیادہ گہرا سایہ
نظر آ رہا تھا۔ یہ وہ سیاہ کبھی تھی جس میں کالے گھوڑے جتے ہوئے تھے چارلس نے
ڈانکا کو اٹھا کر کوچوان کی نشست پر بٹھا دیا اور خود بھی اچک کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

تھے۔ کیونکہ وزنی بکھی بھی ان کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔
 اور پھر اچانک چوراہا سامنے نمودار ہو گیا۔ چارلس نے اپنے جسم کی پوری قوت
 صرف کر کے لگائیں کھینچ لیں۔ وہ گھوڑوں کو جوزف باؤ کی طرف موڑ رہا تھا۔
 لگاموں کے کھنچاؤ سے مجبور ہو کر اور دھول کا ایک بادل سا اڑا کر گھوڑے توڑ گئے
 لیکن بکھی نہ مڑی۔ جس نشست پر ڈانٹا بیٹھی ہوئی تھی اس کے عین نیچے سے تڑانے
 کی آواز سنائی دی اور ڈانٹا کو کچھ دھندلا سا احساس ہوا کہ بکھی کا ایک ٹوٹا ہوا پیہ اپنی
 جگہ سے الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے کنارے تک چلا گیا۔ ایک لمحے تک وہ کہیں
 گرتی رہی۔ ایک لمحے تک جو اسے خوفناک حد تک طویل معلوم ہوا۔ وہ آسمان اور
 زمین کے درمیان معلق رہی اور پھر زمین اور بکھی کے نچلے حصے کی ٹکر ہو گئی۔
 ”خر۔ خر۔“ کی آواز بلند ہوئی، بکھی زمین پر جھک گئی۔ ایک اور تڑانہ سنائی دیا اور
 ڈانٹا نشست پر سے لڑھک گئی۔

جیسے زمین و آسمان نے جگہ بدل لی، پوری دنیا گھوم گئی، ڈانٹا نے اپنے دونوں ہاتھ
 چلائے کہ اس چیز کا سارا لے لے جو وہاں نہ تھی، ایک اندھیرا تھا جس میں بھنور سے
 پڑ رہے تھے۔

اور پھر وہ گری۔ چت گری سر سے لے کر اڑیوں تک جیسے کسی نے ایک تختہ پر
 جڑوا ہو، ایک زوردار اور عظیم ضرب جس سے اس کی ریڑھ کی ہڈی چرچر اٹھی۔
 اور پھر مہیب اندھیرے نے اسے اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ پھر کچھ نہ تھا۔ سب کچھ
 گم تھا۔ حواس بھی اور قیاس بھی۔

لڑھکتا ہوا بکھی خنق کے چوٹی پل سے ایک طوفان کی طرح گزر گئی چارلس
 بڑی بیداری سے گھوڑوں پر چابک برسا رہا تھا۔ اس پر جیسے بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ڈانٹا
 نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی اسے کچھ کہا۔ قعر ڈریکولا خطرناک تھا،
 پر اسرار تھا اور وہ اس سے جلد از جلد بہت دور پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ
 چارلس گھوڑوں کو یوں بے تحاشہ اس لئے بھگا رہا تھا کہ وہ بھی حد سے زیادہ خوفزدہ
 تھا۔ ڈانٹا کو احساس تھا اور وہ جانتی تھی کہ چارلس کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ
 ڈریکولا انسان نہ تھا بلکہ کچھ اور تھا کیا تھا؟ اس کا جواب انہیں فی الحال نہ ملا تاہم اتنا تو
 انہیں معلوم ہی ہو چکا تھا کہ وہ عجیب اور مافوق الفطرت قوتوں کا مالک تھا اور یہ کہ اگر
 انہوں نے ذرا بھی سستی کا ثبوت دیا، گھوڑوں پر ذرا بھی رحم کیا تو ڈریکولا اپنی قوتوں
 کے زور سے انہیں واپس قعر کی طرف نہ صرف موڑ دے گا بلکہ انہیں اس طرف بلا
 بھی لے گا اور پھر۔۔۔ خدا جانے کیا۔

رفار کم کئے بغیر بکھی موڑ مڑ گئی اور اس کے پیچھے جیسے احتجاجا جچ اٹھے بکھی کسی
 جاندار کی طرح اچھل کود کر رہی تھی۔ جیسے اپنی سواریوں کو پھینک دینا چاہتی ہو۔ ڈانٹا
 گرنے سے بچنے کے لئے چارلس سے لپٹ گئی۔

”سڑاک۔ سڑاک“ چابک گھوڑوں پر برس پڑا اور وہ گردن توڑ تیزی سے وہ
 طویل ڈھلان اترنے لگے جو چوراہے تک جاتی تھی۔ بکھی ان کے پیچھے بھاگی آ رہی
 تھی۔

ڈھلان عمودی ہو گئی۔

اور اب چارلس کو ہوش آیا اور اسے احساس ہوا کہ لگائیں کھینچنے کا وقت آیا
 تھا۔ لیکن اب وہ دقت نکل چکا تھا۔ اسے بہت دیر کے بعد خیال آیا تھا وحشت زدہ
 گھوڑوں کو اب قابو میں لینا ممکن نہ تھا۔ خود گھوڑے بھی اپنے آپ کو نہ روک سکتے

باب-۷

نہی۔ اس نے دیکھا کہ بکھی ٹوٹ چکی ہے لیکن ڈانٹا اس سے لپٹی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ گھسیٹ رہی ہے اور گھوڑے اس ٹوٹی ہوئی بکھی اور ڈانٹا کو گھسیٹتے ہوئے قصر ڈریکولا کی طرف لئے جارہے ہیں۔ اور وہاں وہ دونوں خطر کھڑے ہوئے ہیں۔ وہی مغرب ڈریکولا اور وہی ڈائن ہیلن۔

چارلس کانپ گیا اور پھر اسے ڈانٹا نظر آگئی۔

وہ چند گز کے فاصلے پر بے حس و حرکت ایک ڈھیر کی طرح پڑی ہوئی تھی چارلس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی اور اس کا ماتھا سرد ہو گیا۔ اپنی چیخ کو گلے میں ہی روک کر وہ ڈانٹا کی طرف دوڑ پڑا۔ گرا اٹھا اور پھر اس کی طرف دوڑا جیسے جیسے وہ اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا اس کے دل میں بھیاںک اندیشوں کا جھوم بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اس نے اونڈھے منہ پڑی ہوئی ڈانٹا کو لٹکھا کر چپٹ لٹا دیا۔

اس کے بالوں کے نیچے سے خون کی ایک باریک سی لکیر نکل آئی تھی اور خود ڈانٹا کا رنگ ناقابل یقین حد تک زرد تھا۔ اب یہ کتنا مشکل تھا کہ اس کا رنگ واقعی ایسا مردہ کا سا ہو گیا تھا یا پھر وہ زرد اور مردہ چاندنی کی وجہ سے اسی معلوم ہو رہی تھی۔ بعض اوقات چاندنی عجیب کھیل کھیل کر نظر کو دھوکہ دے جاتی ہے اور خون کی وہ لکیر..... وہ بھی ایک معمولی سی سیاہ لکیر معلوم ہو رہی تھی۔

وہ اس کے اوپر جھکا اس کا نام پکارتا رہا لیکن وہ بیدار نہ ہوئی۔ بیدار ہونا تو دور کی بات ہے اس نے حرکت تک نہ کی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ ڈانٹا کے سینے پر رکھ دیا۔ اس کا تنفس چل رہا تھا۔ چارلس کو یقین ہو گیا کہ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ زندہ تھی اور..... اور..... اس نے موہوم سی حرکت بھی کی تھی۔ لیکن چارلس کا سر گھوم رہا تھا جسے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تمام رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کانپ رہے

رات کو سیاہ ہونا چاہئے تھا وہ سرخ تھی۔ خون کی طرح سرخ، وہ اندھیرا نہ تھا۔ سیاہی مائل سرخی۔ چارلس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو یہ سرخی پکھل کر مختلف اور شوخ رنگوں کی روشنی میں تبدیل ہو گئی اور اتنی تیز تھی یہ روشنی کہ چارلس کی آنکھوں میں چھ رہی تھی۔ حقیقت میں بے شمار سوئیوں کی طرح چھ رہی تھی اور وہ اس کی چہن محسوس کر رہا تھا۔

اور پھر چارلس نے اپنے نیچے کوئی نرم اور نرم سی چیز محسوس کی۔ گھاس نرم نرم گھاس۔ وہ شاید زمین پر پڑا ہوا تھا جہاں گھاس آگ رہی تھی لیکن زمین گول گول گھوم رہی تھی۔ چرخی کی طرح بس گھوم رہی تھی۔ چارلس نے گھومتی ہوئی دنیا پر اپنے آپ کو ٹکا رکھنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ نیچے ٹیک کر آنکھیں کھول دیں اور چند ہیا دینے والی روشنی کے الجھڑے دیکھنے لگا۔

رفتہ رفتہ روشنی کی رنگین دھجیاں مدھم ہو کر فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ کوئی الو اپنی منحوس آواز میں چیخ رہا تھا، ہوا درختوں کے چوں اور ٹہنیوں سے لپٹ کر سسکیاں بھر رہی تھی اور بادل کے ایک کٹڑے کے کنارے میں سے چاندنی کی شعاعیں پھوٹ کر آسمان پر پھیلنے لگی تھیں۔

وہ بدقت تمام اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس پر اسرار بکھی کا کہیں پتہ نہ تھا جس میں سوار ہو کر وہ ڈانٹا قصر ڈریکولا سے فرار ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے گھوڑے اسے گھسیٹ کر لئے گئے تھے اور کہیں آگے جا کر وہ یا تو الٹ گئی تھی یا ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

لیکن ڈانٹا..... ڈانٹا کہاں تھی؟

اس سوال کے جواب میں اس کے تصور نے جو تصویر دکھائی وہ بڑی ہی لرزہ خیز

دی تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ چنانچہ بے حد نزدیک اس کے باوجود بے حد دور راستہ سیدھا اور صاف تھا لیکن اس کے لئے بہت طویل اور مشکل تھا۔

وہ جنگل میں گھس پڑا۔ یہاں وہ ایک حد تک محفوظ تھا۔ اپنی بیوی کا بوجھ سنبھالے وہ بڑی احتیاط سے چل رہا تھا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ اگر کوئی انہیں تلاش کر رہا ہو تو ان آوازوں سے ان کا پتہ معلوم نہ کر لے۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود خشک پتے ان کے قدموں تلے چر مرا رہے تھے اور خشک شبنیاں چٹانوں کی آواز کے ساتھ ٹوٹ رہی تھیں اور یہ چٹانے چارلس کو دھماکے معلوم ہو رہے تھے۔ جھاڑیاں اس کے کٹ سے لپٹ لپٹ جاتی تھیں اور جب وہ آگے بڑھ جاتا تھا تو وہ اس کا دامن چھوڑ کر دیے زور سے درختوں کے تنوں سے ٹکرا جاتی تھیں۔

چارلس آگے بڑھتا رہا لیکن اس کا ہر قدم یوں اٹھ رہا تھا جیسے وہ چٹنی اور گھٹنوں تک گہری کچھ میں چل رہا ہو درختوں کی لگتی ہوئی شبنیاں اس کے چہرے سے ٹکراتی رہیں۔ اس کی آنکھیں جھپک کر بند ہو جاتیں اور پھر فوراً ہی کوئی شنی جابک کی طرح اس کے رخسار پر پڑتی۔ یہ تو خیر رات کا وقت تھا لیکن دن کے وقت بھی اس جنگل میں چلنا مشکل ہوتا کیونکہ ہر درخت سے بھیلیں لپٹ رہی تھیں، مٹی برابر جگہ بھی خالی نہ تھی، ہر جگہ مختلف قسم کی خاردار چھاڑیاں آگ رہی تھیں اور درخت یوں طے کھڑے تھے جیسے سر سے سر جوڑے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

اس کا سانس پھول گیا تھا اور اس کے حلق سے سیٹیوں کی آواز کے ساتھ نکل رہا تھا۔ کئی منٹوں تک وہ ڈانٹا کا نام پکارتا رہا۔ اسے تسلی دیتا رہا، دعائیں مانگتا رہا اور اس کی امیدیں بندھاتا رہا لیکن ڈانٹا کچھ سن نہ رہی تھی اور یہ وہ خود بھی جانتا تھا چنانچہ یہ الفاظ وہ خود اپنی ڈھارس کے لئے بڑبڑا رہا تھا۔ لیکن پھر وہ یہ بھی نہ کر سکا۔ اس کی آواز خود بخود ڈوب گئی اور لفظوں نے دم توڑ دیا۔

تھے۔ اس حالت میں وہ کوئی بھی بات یقین سے کیسے کہہ سکتا تھا؟۔ خود اس کی حالت غیر ہو رہی تھی پھر وہ کیسے معلوم کر سکتا تھا کہ ڈانٹا زندہ تھی یا۔۔۔؟

بیہوش یا شاید مرہ ڈانٹا کو اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں پر اٹھالیا۔ اور آج پہلی دفعہ وہ ڈانٹا کا بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ شادی کی پہلی رات کو وہ ڈانٹا کو اس طرح اٹھا کر جگہ عروسی میں داخل ہوا تھا اور اس وقت اس نے اس کا بوجھ محسوس نہ کیا تھا۔

اس کے پیر من من بھر کے ہو رہے تھے اور وہ ہر قدم بڑی کوششوں کے بعد اٹھا سکتا تھا۔ تاہم وہ ڈانٹا کو اٹھائے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ کسی طرف جا رہا تھا لیکن کوئی آواز اس کے دل میں کہہ رہی تھی کہ چوراہے کے قریب ٹھہرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کی چھٹی حس اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد اس چوراہے سے دور چلا جائے اور اس سے پہلے کہ قعر ڈرکولا کی وہ دو عفریت۔۔۔۔۔ ڈرکولا اور ٹیلن۔۔۔۔۔ ان کے تعاقب میں نکل پڑیں وہ کسی محفوظ جگہ پہنچ جائے۔۔۔۔۔ وہ ڈرکولا کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ اسے شکست نہ دے سکتا تھا۔ چنانچہ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ وہ فرار ہو جائے اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ ڈرکولا اور ٹیلن اسے اور ڈانٹا کو تلاش کرنے میں ناکام رہیں۔

چنانچہ وہ کسی طرف جاتا اس سے کوئی فرق نہ پڑ جانے والا تھا۔ اس کے لئے چاروں سمتیں برابر تھیں کچھ دور آگے بڑھنے کے بعد وہ رک گیا اور سوچنے لگا کہ کسی طرف چلا جائے۔ جوزف باد ٹھیک رہے گا۔ وہاں کے لوگ تو ہم پرست تھے۔ تاہم وہیں جانا مناسب ہو گا۔ جس راستے سے وہ اس طرف آئے تھے وہ بے حد طویل راستہ تھا اور آبادی بہت دور تھی چنانچہ صرف جوزف باد کچھ قریب تھا حالانکہ اس حالت میں وہاں تک بھی پہنچنا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ چارلس کو یاد آیا کہ جوزف آباد

اور کوئی آواز اس کے دل میں کہہ رہی تھی کہ اسے اپنی شکست قبول نہیں کرنی ہے۔ اس نے اپنا سر اٹھایا۔ ڈانکا ایک زرد ڈھیر کی طرح پڑی ہوئی تھی درختوں کے پتوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی چاندنی کے گول داغ اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ مافوق البشرانہ قوت اور کوشش سے کام لے کر وہ ان کی طرف بیٹھنے لگا۔

وہ ڈانکا کے قریب لیٹ گیا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بدستور زرد تھا۔ زردی اس کے بشرے پر جیسے منجمد ہو کر رہ گئی تھی اور اس کے ماتھے پر خون بھی جم کر لو تھوڑے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مایوسی سے وہ کراہ رہا تھا۔

اس نے اپنی بیوی کے زرد اور خاموش چہرے کو چھونے کے لئے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ ڈانکا تک نہ پہنچا۔ چنانچہ ذرا اور آگے گھسیٹ آیا اور اپنے جسم کو ایک کہنی کے سارے ذرا سا اوپر اٹھا کر اپنا ہاتھ ڈانکا کی طرف بڑھایا لیکن اس کا ہاتھ ہوا میں ہی اٹھا رہ گیا۔

ڈانکا کے قریب ایک سایہ کھڑا ہوا تھا۔ وہ نہ تو درخت تھا اور نہ ہی کوئی جھاڑی۔ وہ کوئی انسان تھا۔ چارلس کے دیکھتے ہی اس سائے نے حرکت کی۔ وہ ایک قدم ڈانکا اور چارلس کی طرف بڑھا۔

چارلس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور اس نے اٹھنے کی دیوانہ وار کوشش کی۔ اور فوراً ایک آواز نے جو اس جھل کی طرح گھمبیر تھی۔ ”سرسہ چارلس! میں نے جنہیں پہلے ہی بخوار کر دیا تھا کہ اسے بھی قہر کے تہب نہ جانا“

یہ قادر شینڈور کی آواز تھی۔

اس نے ایک ٹھوکر کھائی، لڑکھڑا کر جھکا، پھر منبھلا، اپنا توازن قائم کیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ چند منٹوں تک اپنا دم درست کرتا رہا اور پھر آگے بڑھا۔ لیکن اب اس کی قوت جواب دینے لگی تھی۔ اس کی ٹانگیں آپس میں ٹکرا رہی تھیں اور پھر وہ بالکل ہی جواب دے گئیں اور وہ اپنی بیوی کو سنبھالے ڈھے گیا۔

زینن پر کانٹے تھے، درختوں کی خشک چھال پڑی تھی اور جڑیں ابھری ہوئی تھیں، گرنے یا بیٹھنے کے لئے یہ بڑی تکلیف دہ جگہ تھی۔ لیکن چارلس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ اب اسے کسی چیز کی پروا نہ تھی۔ وہ احساس کی حدود سے پرے پہنچ چکا تھا۔ ڈانکا اس کے ہاتھوں پر سے لڑھک کر دھپ سے نیچے جا پڑی لیکن اس کی بھی چارلس نے پروا نہ کی اور اب پروا کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ اب یہی ان کی آخری منزل تھی۔ اس سے آگے وہ نہ جاسکتا تھا۔ وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اور وہ قعر ڈرکھولا کے عفریت انہیں تلاش کرتے ہوئے شاید اسی طرف آرہے تھے۔

چارلس اندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس کا ایک رخسار سر زمین پر ٹکا ہوا تھا اور زمین کی ٹھنڈک رفتہ رفتہ اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر رہی تھی اور کسی درخت کی ابھری ہوئی جڑ یا شاید کوئی شنی اس کی بائیں کہنی میں بیدردی سے چبھ رہی تھی لیکن اس نے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ وہ مختصر رہا کہ زمین ایک بار پھر تیزی سے گھومنے لگ جائے، ایک بار پھر رات کا اندھیرا سرفی میں تبدیل ہو جائے اور پھر یہ سرفی اسے نگل لے اور وہ بے ہوش ہو کر اس تھکن، امید و یقین اور خوف سی آزاد ہو جائے۔ لیکن نہیں اس کے پھولے ہوئے سانسوں کی آواز زندگی کی آواز تھی۔ وہ زندہ تھا۔ لیکن تھک چکا تھا۔ وہ اپنی ہار تسلیم کر لیتا چاہتا تھا لیکن خود اس کے جنس کی آواز اس کی ہمت بندھا رہی تھی۔ زندگی سے لپٹے رہنے کے لئے اسے اکسار ہی تھی

اس نے اٹھ بیٹھنے کی کوشش کی اور پھر اپنے ہاتھوں کا زور لگا کر اٹھا۔
”اٹا۔ آ۔ آ۔ آ۔“

ایک دروازہ چرچا کر کھلا اور ایک راہب کمرے میں داخل ہوا۔
”شکر ہے مسٹر کینٹ کہ آپ بیدار ہو گئے۔“ راہب نے کہا۔
”میری بیوی۔۔۔“

”فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کی بیوی مزے میں ہیں اور اب تک سوری ہیں۔ ان کی فحاشی کئی ہفتوں تک قائم رہے گی۔۔۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں وہ اچھی ہیں۔“

”میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”فی الحال انہیں آرام کرنے کی سخت ضرورت ہے۔“

”میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ چارلس نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

”بے شک آپ انہیں دیکھ لیں گے۔“

”کب؟“

”جب وقت آئے گا۔“

چارلس کے داغ کے کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اتنے کم وقت میں اتنے بہت سے واقعات ہو چکے تھے کہ وہ کسی پر اعتبار نہ کر سکتا تھا۔ کسی کی بھی ممان نوازی ایک جال ہو سکتی تھی۔ ہر تسکین بخش لفظ اسے دھوکا دینے کے لئے کہا جاسکتا تھا کہ اسے ہلکا پھلکا کر پھر وہاں لے جایا جائے جہاں سے وہ فرار ہوا تھا۔ وہی قرضو ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا تھا اور جہاں کی ایک ایک اونچ زمین پر خطرہ تھا۔ ایسا خطرہ جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ کسی پر اعتبار نہ کر سکتا تھا۔ کسی کی ممان نوازی اور ہمدردی پر بھروسہ نہ کر سکتا تھا۔

چارلس اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس دفعہ دنیا خود اس کے چاروں طرف گردش کرنے لگی اور وہ خود شرابی کی طرح جھومنے لگا۔ فوراً ایک مضبوط ہاتھ اس کی کمر پر آپڑا۔ اس ہاتھ نے اسے سارا دیا۔ اس کے ہاتھ سے تسکین اور اطمینان کی لہر پھوٹ کر چارلس کے جسم میں سرایت کر رہی تھی اور اسے احساس ہوا کہ وہ اب محفوظ تھا اور ڈانٹا بھی محفوظ تھی۔

چنانچہ چارلس نے آخر کار اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اسے ہوش آیا اور اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو پہلے تو اس کا سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن چند لمحوں بعد ہی اس نے دیکھا کہ خوف ناک جنگل کی الجھن ہوئی جلیں اور خاردار جھاڑیاں بے رنگ دیواروں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ جت پڑا سوچتا رہا کہ وہ کہاں تھا؟ اوپر درختوں کی آہیں میں الجھی ہوئی شنیار نہ تھیں بلکہ سنگین چھت تھی۔

اس نے آہستہ سے کروٹ لی۔ وہ ایک تنگ سے حجرے میں تھا اور گھاس پر نہیں بلکہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ بستر سخت مگر آرام دہ تھا۔ حجرے کے ایک کونے میں ایک میز اور اس کے سامنے ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میز پر میزپوش نہ تھا اور کرسی پر گدا نہ تھی۔ یہ دونوں چیزیں اپنی سادگی اور ننگے پن کے باوجود باعث تسکین تھیں۔

یہ ایک غیر مانوس سا کمرہ تھا۔ ایسا کمرہ جس کا وہ عادی نہ تھا۔ یہ اس کے گھر کے کمرے کی طرح نہ تھا اور نہ ہی کسی ہوٹل کے کمرے جیسا تھا جس میں وہ اور ڈانٹا اس سفر کے دوران مقیم ہوئے تھے۔ لیکن اس کمرے کی خاموشی اور ٹھنڈک میں کوئی خاص بات تھی جو اس کے دل پر عجیب طرح سے اثر انداز ہو رہی تھی باوجود کوشش کے وہ اس اثر کو سمجھ نہ سکا۔

”اٹا۔ آ۔ آ۔ آ۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

اس نے پوچھا ”میں کہاں ہوں؟“

”آپ ہماری خانقاہ میں ہیں“ جواب ملا۔

”خانقاہ! کون سی خانقاہ؟“

”کیلن برگ کی خانقاہ۔“

اور اس کے دماغ کا دریچہ کھل گیا اور اسے وہ راہ یاد آگیا۔



کیا نام تھا اس کا؟ ہاں شینڈور، قادر شینڈور اور پھر اسے یاد آیا کہ قادر شینڈور نے ان سے کہا تھا کہ وہ بھولے سے بھی قصر کے قریب نہ جائیں۔۔۔۔۔ اور پھر اسے یہ بھی یاد آگیا کہ قصر سے فرار ہونے کے بعد جب وہ جنگل میں تھا، اور ہمت ہار چکا تھا تو قادر شینڈور وہاں آگیا تھا اس کی سرزنش کے الفاظ بھی چارلس کو یاد آگئے۔

”قادر شینڈور۔۔۔۔۔ اس نے کہا۔

”آپ کپڑے پن لپیٹے۔ پھر میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں گا۔ وہ خود آپ سے ملاقات کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔“ وہ دروازے کی طرف گھوم گیا ”آپ تیار ہو جائیں تو مجھے آواز دے لیجئے گا۔“

”آپ کا نام؟“

”مارک۔۔۔۔۔ برادر مارک“

چارلس خود قادر شینڈور سے ملنا چاہتا تھا۔ جلد از جلد ملنا چاہتا تھا۔ بہت سے سوالات اس کے دماغ میں سنپولیوں کی طرح کلبلا رہے تھے اور وہ ان سوالات کے جواب حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ چنانچہ وہ کپڑے پہنے لگا لیکن ایسا معلوم ہوا کہ وہ تیزی اور پھرتی کا ثبوت نہ دے سکتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ بھی ہلا سکتا تھا۔ وہ اس شخص کی طرح محسوس کر رہا تھا جو فالج کے شدید حملے کے بعد ابھی ابھی بہتر سے اٹھا ہو۔ اس کی حرکت بے حد سست تھی جیسے اس کے اعصاب پر حکم رساں

مطالعہ گاہ میں وہ ایک اسکالر اور مفکر ظاہر ہو رہا تھا قادر شینڈور کی ایک نہیں بلکہ کئی شخصیتیں تھیں اور مختلف ماحول میں اس کی مختلف شخصیتیں نمایاں ہو جاتی تھیں اور اس کے لئے اسے کوئی ریاض نہ کرنا پڑتا تھا۔ بلکہ یہ ایک قابل رشک عطیہ تھا جو خود قدرت نے اسے عطا کیا تھا۔

حالانکہ اس کا لہجہ نرم اور شائستہ تھا۔ تاہم اس نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔
”مسٹر چارلس! قعر میں جو کچھ ہوا اس کی تفصیلات بیان کرنے کے لئے آپ تیار ہیں۔؟“

قعر میں جو کچھ ہوا تھا اس کی تفصیلات خود چارلس کے دماغ پر ایک بوجھ بنی ہوئی تھیں اور وہ یہ بوجھ بہر حال اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ بے شک وہ تیار تھا۔ وہ پوری داستان سنا دیتا چاہتا تھا، تاکہ پھر قادر شینڈور اس سے کوئی نتیجہ اخذ کر کے خود چارلس کو بتا سکے کہ یہ سب کیا تھا۔ تاکہ پھر اندھیرے میں روشنی غالب آجائے اس بھیاںک خواب پریشاں کی تعبیر معلوم ہو سکے۔ اور وہ لرزہ خیز سراپ ہٹ جائے جس کا سایہ چارلس اپنے سر پر محسوس کر رہا تھا۔

چنانچہ چارلس نے اپنی داستان شروع کی۔

اس نے بتایا کہ کسی طرح سرائے سے روانہ ہو کر چوراہے تک پہنچ گئے اور چارلس کو احساس ہوا کہ اس سفر کی ایک ایک تفصیل اس کے دماغ پر نقش تھی وہ کوئی معمولی سی بات بھی نہ بھول رہا تھا، خود چارلس کے لئے یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی کہ جیسے جیسے وہ بیان کر رہا تھا۔ اس بیت ناک داستان کی حمیں خود بخود کھلتی جاری تھیں اور پچھلے تمام واقعات از سرفو اس کی نظر کے سامنے وقوع پذیر ہوتے جا رہے تھے، ایک بار پھر وہ انہی واقعات سے گزر رہا تھا اور انہی ناقابل فہم خطرات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ اپنی داستان سنا کر خاموش ہوا۔ تو خزاں رسیدہ

کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ یا ان میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے دماغ اور اعصاب کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ بہر حال وہ کپڑے پہننے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اب وہ محکم محسوس کر رہا تھا۔ اور اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ بستر پر بیڑ گیا۔ اور کئی منٹوں تک بیٹھا رہا۔

”برادر مارک“ آخر کار اس نے آواز دی۔ اس کی آواز کھوکھلی تھی اور زیادہ بلند نہ تھی۔

فورا دروازہ کھول کر برادر مارک اندر آ گیا۔

اور وہ برادر مارک کے پیچھے چل پڑا۔ اور اس نے چارلس کو قادر شینڈور کی مطالعہ گاہ میں پہنچا دیا۔

یہ کمرہ اس کمرے سے نسبتاً بڑا تھا جس میں سے چارلس نکل کر آیا تھا اس کمرے میں بھی ویسی سادگی تھی جو اس کمرے میں تھی جس میں چارلس کو ہوش آیا تھا۔ البتہ اس کمرے میں الماریوں کی ایک قطار تھی اور ان الماریوں میں موٹی موٹی اور مراکشی چمڑے کی جلد والی خوبصورت کتابیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔

قادر شینڈور اس کے استقبال کو اٹھ کھڑا ہوا اور چارلس نے دیکھا کہ اس کے بشرے سے وہ بٹاشٹ عیاں نہ تھی جو چارلس کو ان کی پہلی ملاقات کے وقت نظر آئی تھی۔ قادر شینڈور کے بشرے سے اس وقت سنجیدگی عیاں تھی اور وہ خود بے حد گھمبیر نظر آ رہا تھا۔ اور چارلس کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ راہب قاتل رشک اور مافوق طبیعت کا مالک ہے چنانچہ وقت اور ماحول کے مطابق اپنی طبیعت اور جذبات کو تبدیل کر لیتا ہے۔ چونکہ اس وقت وہ کسی سرائے میں نہیں بلکہ خانقاہ میں تھا اور یہاں کا ماحول سنجیدہ اور خاموش تھا۔ چنانچہ خود شینڈور بھی سنجیدہ اور گھمبیر بن گیا تھا۔ اس ماحول سے باہر وہ لوگوں سے ہنس بول سکتا تھا۔ فقرے چست کر سکتا تھا لیکن یہاں اپنی

چنے کی طرح کانپ رہا تھا۔

”تو یہ بات ہے۔“ قادر شینڈور نے سر ہلا کر کہا، وہ پھر زندہ ہو گیا۔

”پھر زندہ ہو گیا! کون؟“

”میں یہاں کے راہبوں سے اور ارد گرد کے بستی والوں سے اور دور دور تک کے لوگوں سے کہا کرتا تھا۔ کہ اس عفریت کا جو زمانہ ختم ہوا تھا، وہ پھر واپس آ گیا ہے۔ ایک بار پھر اس کی خوفناک حکومت کا آغاز ہوگا۔“

”بچے غائب ہونے لگیں گے۔ لڑکیوں کی شہ رگ پر دو سوراخ نظر آئیں گے وہ سفید ہوتی چلی جائیں گی اور پھر مرجائیں گی لیکن مرنے کے بعد بھی انہیں سکون نصیب نہ ہوگا۔ کیونکہ مرنے کے بعد وہ ذاتوں کو اپنی قبروں سے نکل آئیں گی اور شکار کی تلاش میں بھگتی پھریں گی۔ پھر وہ واپس آ گیا ہے۔ وہ زندہ ہو گیا ہے۔“

”کون؟ کس کے متعلق کہہ رہے ہیں آپ؟“

”مسٹر چارلس! آپ اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ اس کے باوجود مجھ

سے پوچھ رہے ہیں۔“

”کونٹ ڈریکولا!۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”وہ تو مر چکا تھا۔“

”بے شک۔ لیکن اب وہ زندہ ہے۔“

”کیسے یقین۔۔۔۔۔“

”خود آپ اسے دیکھ چکے ہیں۔ وہاں قبر ڈریکولا میں آپ اس سے ہاتھ پائی کر چکے ہیں۔“

”لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔“

”مسٹر چارلس آپ نہیں جانتے کہ کہاں آگئے ہیں۔“

”کہاں آگیا ہوں؟“ چارلس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ یا تو وہ پاگل ہو گیا ہے یا پھر ساری دنیا پاگل ہو گئی ہے۔

”ویپیائوں کی سرزمین میں۔“

”ہائیں!۔“ چارلس چکرا گیا۔

اور خود آپ کے بھائی نے اسے حیات نو بخشی ہے۔ جو دنیا کے تمام ویپیائوں کا آقا ہے جو سب سے زیادہ خطرناک ہے۔“

”میرے بھائی نے! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”مسٹر چارلس! آپ کے بھائی اس لئے مارے گئے کہ کونٹ ڈریکولا زندہ ہو جائے

اور وہ زندہ ہو گیا دنیا کا سب سے زیادہ لعنتی اور سب سے زیادہ خطرناک ویپیائے۔“

چارلس حیران تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ قادر شینڈور جو کچھ کہہ رہا ہے وہ حقیقت تو نہیں ہو سکتی، یہ راہب شاید مذاق کر رہا تھا۔

چارلس نے ویپیائوں کے متعلق بہت کچھ پڑھا تھا۔ خوبصورت جلد والی کتابوں میں پڑھا تھا۔ اپنے وطن لندن اور اپنے آراستہ اور روشن کمرے میں آرام دہ کرسی میں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ اسے یہ کتابیں بڑی دلچسپ معلوم ہوئی تھیں سادہ لوح دیہاتیوں اور کاشت کاروں کی اس توہم پرستی پر وہ مسکرایا کرتا تھا۔

”یقین نہیں آ رہا مسٹر چارلس؟“ قادر شینڈور نے اس کی دلی کیفیت معلوم کر کے کہا۔ ”کونٹ ڈریکولا“ آپ کے وطن میں لندن آچکا ہے ثبوت چاہتے ہو؟ اور قادر شینڈور نے ایک فائل میں سے کسی اخبار کا تراشہ نکال کر دکھا۔ اور پھر آہستہ سے اس کی طرف بڑھا دیا۔

”پڑھو اسے۔“

یہ اخبار ”ڈیلی گراف“ کا تراشہ تھا۔ چارلس پڑھنے لگا۔

دقت تک نگر نہ اٹھائیں گے جب تک کہ طوفان گزر نہیں جاتا۔ شام ہوتے ہوتے ہوا بند ہو گئی۔ آدمی رات ہوئی تو ہوا نام کو نہ تھی۔ اور فضاء میں ایسی خاموشی تھی جو عموماً طوفان سے پہلے ہوتی ہے ایسی خاموشی اور اعصاب پر سوار ہو جانے والی رات کا تجربہ دھبی کے باشندوں کو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ فضاء میں اتنا گھجس تھا کہ لوگوں کے دم گھٹ رہے تھے۔ سمندر سنسان تھا۔ مای گھو اپنی کشتیاں ساحل پر لے آئے تھے۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے جہاز بھی جو ساحلوں کے قریب چکر لگایا کرتے ہیں محفوظ مقامات پر پہنچا دیئے گئے تھے۔ سمندر ویران تھا۔ البتہ ایک بدیسی جہاز دور نظر آ رہا تھا۔ اس جہاز کے سب ہی بادبان کھلے تھے اور وہ مغرب کی طرف جاتا معلوم ہوتا تھا۔ اس جہاز کے کپتانوں کی لاعلمی اور حماقت بحث کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ بندرگاہ کے محافظوں نے جھنڈیوں کی زبان میں اس بدیسی جہاز کے کپتان کو متوقع خطرے سے آگاہ کرنے کے کی کوشش کی لیکن کچھ نہ ہوا۔ جہاز کے تمام بادبان بدستور کھلے تھے رات کا اندھیرا اترنے سے پہلے تک وہ جہاز اپنے کھلے ہوئے بادبانوں سمیت دیکھا گیا۔ وہ یوں ڈول رہا تھا جیسے اس کا کوئی مالک ہی نہ ہو۔ جیسے وہ بے سارا ہو۔

دس بجنے سے کچھ پہلے ہوا بالکل بند ہو گئی اور فضاء اتنی خاموش تھی کہ چراگاہ میں مینائی ہوئی بھیڑوں اور دور گھائی میں بھونکتے ہوئے کتوں کی آوازیں قصبے کے آخری سرے تک سنی گئیں۔ آدمی رات کا گمراہی بھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ سمندر کی دسعتوں میں سے گزر گراہٹ کی عجیب سی آواز سنائی دی۔ جس کی گونج خاموش فضاء میں بہت دیر تک تیرتی رہی۔

اور پھر حیرت انگیز سرعت سے، جو قطعی ناقابل یقین اور بعد میں غور کرنے سے ناممکن معلوم ہوئی۔ طوفان پھٹ پڑا، فضاء کا سکون درہم برہم ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سمندر میں کوہ پیکر موجیں اٹھنے لگیں۔ طوفان کا زور دم بدم بڑھتا ہی چلا گیا اور سمندر

مارے نامہ نگار کے قلم سے

۱۸ اگست:

دھبی۔

ایک زبردست اور ناگہانی طوفان جیسا کہ پچھلے سو سال سے نہیں دیکھا گیا، آج یہاں پھٹ پڑا، اور اس طوفان کے جو نتائج ظاہر ہوئے وہ نوعیت کے اعتبار سے انوکھے اور حیرت انگیز تھے موسم گرم تھا اور فضاء میں گھس ماہ اگست میں عموماً ہوتا ہی ہے۔ ہفتے کی شام بے حد خوشگوار تھی۔ چنانچہ بہت سے شوقین مزاج لوگ اتوار گزارنے کے لئے دھبی کے قریبی جزائر میں گئے تھے۔ ”ایما“ اور ”اسکراپو“ نامی چھوٹے جہازوں نے ان تفریح کرنے والوں کو جزائر تک پہنچانے کے لئے دھبی سے جزائر تک کئی پھیرے کئے۔ دن، دوپہر ڈھلنے تک بے حد خوشگوار اور روشن رہا چند بے فکرے، جو اپنی شامیں دھبی کے قبرستان میں گزارتے ہیں وہاں گئے وہ پرسکون سمندر کا نظارہ کر رہے تھے کہ ان میں سے ایک کی نظر اچانک کسی انجانے جہاز پر پڑی جو بہت دور تھا۔ اور جیسے یکایک ہی جنوب مغربی افق سے نمودار ہو گیا تھا۔ اس وقت شمالی مشرق کی طرف سے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ بحری پولیس کا ایک آدمی فوراً اس پہاڑی پر پہنچ گیا جس پر قبرستان ہے اور اس نے دور بین کے ذریعے دور نظر آتے ہوئے جہاز کا معائنہ کیا اور پھر بندرگاہ کے افسروں کو اطلاع دی۔ ایک بوڑھے مای گھو نے، جو اسی قبرستان میں بیٹھا کرتا ہے، زبردست طوفان کی پیشین گوئی کی سورج غروب ہونے کا منظر اتنا مسرور کن تھا کہ اسے دیکھنے کے لئے دھبی کی نصف آبادی قبرستان والی پہاڑی پر جا پڑی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ غروب آفتاب کا ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ناگہانی اور زبردست طوفان کی اتواہ اب عام تھی۔ چنانچہ ان کپتانوں نے جن کے جہاز دھبی کی بندرگاہ میں نگر انداز تھے۔ فیصلہ کیا کہ وہ اس

تک استعمال نہیں کی گئی تھی۔ لیکن آج اس کی قوت آزمانے کا وقت آیا تھا چنانچہ چند ٹائیوں بعد ہی روشنی کی موٹی لکیر اندھیرے اور امواج سمندر کے سینے پر دوڑ گئی۔ ایک دو دفعہ اس سرچ لائٹ نے بڑا کام بنایا۔ مچھلیاں پکڑنے کی ایک کشتی جو اندھیرے میں ٹانگ ٹوئیاں مار رہی تھی اس کی روشنی میں صحیح سلامت بندرگاہ تک پہنچ گئی۔ ورنہ وہ جنوبی چٹان سے ٹکرانے والی تھی جب بھی کوئی کشتی ساحل یا بندرگاہ پر پہنچتی وہاں کھڑے ہوئے وہ لوگ خوشی کے نعروں اور تالیوں سے اس کا استقبال کرتے اور وہاں کھڑے ہوئے وہ لوگ تھے جن کا دنیا میں کوئی نہ تھا اور جن کی بے فکری ضرب المثل تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی سرچ لائٹ کی روشنی میں ایک جہاز نظر آیا جس کے سارے بادیان کھلے تھے اور جو طوفان میں تنکے کی طرح ڈول رہا تھا یہ وہی بلسی جہاز تھا جو شام کو بہت دور دیکھا گیا تھا۔ ہوا میں اور زیادہ تیزی آگئی تھی اور ساحل پر کھڑے ہوئے لوگ اس جہاز کے انجام کے خیال سے کانپ اٹھے تھے۔ بیشک وہ جہاز خطرے میں تھا۔ بندرگاہ اور جہاز کے درمیان وہ زیر آب چٹانیں تھیں جن سے ٹکرا کر کئی جہاز غرق ہو چکے تھے۔ موجوں کی کوہ پیکری میں کمی واقع نہ ہوئی تھی اور وہ جہاز اس تیزی سے ڈول اور بہہ رہا تھا کہ بقول ایک ملاح ”اب وہ سمندر کی تہ میں ہی ٹکراندا ہوگا“ دفعتاً بہت سا جھاگ فضا میں بکھر گیا اور ساتھ ہی غم آلود کرنے ساحل پر کھڑے ہوئے لوگوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اتنا گاڑھا تھا وہ کہ کہ ٹھوس معلوم ہوتا تھا۔ اس کرنے ساحل پر کھڑے ہوئے لوگوں کو عارضی طور پر اندھا کر دیا تھا البتہ ان کی قوت سامعہ قائم تھی اور وہ کڑک اور گرج کی آوازیں جن کی شدت پچھلی تمام آوازوں سے بڑھ کر تھی سن رہے تھے۔ سرچ لائٹ کا رخ مشرقی چٹان کی طرف پھیر دیا گیا تھا اور اس طرف روشنی ڈالی جا رہی تھی جس طرف کہ اس

کی ہر موج پہلی موج سے زیادہ تباہ کن اور بھیا تک ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ سمندر سے کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا شور بلند ہوا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ لوگ کھبوں وغیرہ سے لپٹ گئے کہ اڑ نہ جائیں۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ ہوا میں سٹی کے بجائے گڑگڑاہٹ کی آواز تھی۔ جو لوگ قبرستان والی پہاڑی اور بلند مقامات پر کھڑے ہوئے تھے انہیں وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ ایک طوفان ہی کیا کم تھا کہ دفعتاً ”سمندر سے گاڑھا گاڑھا کراٹھ کراٹھ کر ساحل پر پھیلنے لگا۔ کھر مرطوب تھا۔ اس قدر مرطوب کہ لوگوں کو یہ وہم ہو گیا کہ یہ کھر دراصل ان لوگوں کی روحیں ہیں جو سمندر میں غرق ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ جواب تک ساحل سمندر اور بندرگاہ پر کھڑے تھے بدحواس ہو کر اپنے گھروں کی طرف بھاگے۔ ہمارا نامہ نگار کہتا ہے کہ فضا میں کوئی خاص بات تھی جس نے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے فضا میں موت رچی ہوئی تھی۔ اور ناقابل فہم کھر گویا موت کا فرشتہ سرد اور بھیا تک کھر کی چادر میں دقا ”فوق“ شکاف پڑ جاتے اور آسمان پر کوندتی ہوئی بجلی میں سمندر سیب دیو کی طرح نظر آتا۔ آسمان پر بار بار بجلی کوند رہی تھی اور کڑک اور گرج کی آوازیں لوگوں کے دل ہلا رہی تھیں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ساتوں آسمان آپس میں ٹکرا رہے ہیں لوگ اپنے گھروں میں سے بیٹھے تھے اور بوڑھے کہہ رہے تھے کہ یہ قہر الہی ہے جو دمبٹی پر نازل ہوا ہے۔ کھر کی چادر میں شکاف پڑنے اور بجلی کے چمکنے سے جو منظر دیکھنے کو ملتا تھا وہ بے حد دلچسپ تھا۔ سمندر کی ہر کوہ پیکر موج سفید سفید جھاگ کو حیرت انگیز اونچائی تک اچھال دیتی تھی۔ اور اس جھاگ کو تیز پھینکتی ہوئی ہوا فضا میں یوں بکھیر دیتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے آتش بازی کے ٹھنڈے اتار چھوڑ دیئے گئے ہوں، آبی پرندے جو گھبرا کر اپنی پناہ گاہوں سے نکل آئے تھے۔ تیز پھینکتی ہوئی ہوا میں بے بسی سے قلابازیاں کھا رہے تھے۔ مشرقی چٹان کی چوٹی پر جو نئی سرچ لائٹ لگائی گئی ہے وہ آج

اندھرا اتر آیا تھا اس وقت کہ سرچ لائٹ کی خیرہ کن روشنی بھی کچھ کام نہ دے رہی تھی۔

چارلس نے خاموشی سے ڈیلی گراف کا یہ تراشہ فادر شینڈور کی طرف بڑھادیا۔
 ”تو اس رات مسٹر چارلس“ فادر شینڈور نے تراشہ فائل میں رکھتے ہوئے کہا
 ”کونٹ ڈریکولا دھبے کے ساحل پر اتر اٹھا“

”لیکن اس تراشے میں کونٹ ڈریکولا یا کسی بھی مسافر کا ذکر تو ہے نہیں“ چارلس نے حیرت سے کہا۔

”ایک جگادری اور خونخوار کالے کتے کا ذکر تو ہے نا؟“

”ہاں ہے“

”بس تو وہی کالا کتا کونٹ ڈریکولا تھا اور عناصر کا وہ کٹرا اسی نے پیدا کیا تھا کہ کوئی اسے ساحل پر اترتے نہ دیکھ سکے اور اس کا تعاقب نہ کرے۔
 ”کیا کہا آپ نے فادر کہ وہ کتا ڈریکولا تھا“
 ”بالکل“

”تو پھر معلوم ہوا کہ وہ اپنا روپ بدل سکتا ہے۔“

”بے شک۔ وہ جو چاہے بن سکتا ہے۔ خصوصاً چگادری اور بھیڑیا“

”اگر ایسا ہی ہے تو پھر جب ہم قعر میں سے فرار ہوئے ہیں تو اس وقت بھی وہ چگادریا بھیڑیا بن کر ہمارا تعاقب کر سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔“ چارلس نے بے یقینی سے کہا۔

”ہاں لیکن ابھی وہ اس درجے تک نہیں پہنچا ہے بات یہ ہے کہ وہ دس سال کے بعد زندہ ہوا ہے۔ آپ کے بھائی کے خون نے اسے زندہ کیا ہے اور آپ کی بھابی کا خون چوس کر اس نے اپنی دس برس کی پیاس بجھائی ہے لیکن اب بھی وہ کمزور ہے

بدلی جہاز کے چٹانوں سے ٹکرانے کا خدشہ تھا۔ لوگ دم سادھے اس جہاز کے انجام کے ہٹکرتے یکایک ہوا کا رخ بدل گیا، جھاگ بیٹھ گیا اور پھر ایک معجزہ ہوا۔۔۔ دونوں چٹانوں کے درمیان یکایک وہ جہاز نمودار ہوا جس کی چابی کے خیال سے لوگ کانپ رہے تھے۔ اب بھی اس کے بادبان کھلے تھے اور اب اس کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ سرچ لائٹ جہاز کے ساتھ ساتھ گھومتی رہی اور جب وہ جہاز قریب آیا تو سرچ لائٹ کی روشنی میں لوگوں نے ایسا منظر دیکھا کہ بعض کی چیخیں نکل گئیں۔ پتوار کے ڈنڈے سے ایک ملاح کی لاش بندھی ہوئی تھی جس کا آگے کی طرف ڈھلکا ہوا سر ایک بھیانک انداز میں دائیں بائیں ڈول رہا تھا۔ عرشے پر اس لاش کے علاوہ کوئی اور نظر نہ آ رہا تھا۔ یہ واقعی ایک حیرت انگیز بات تھی بلکہ معجزہ تھا کہ وہ جہاز اپنے آپ ہی صحیح سلامت بندرگاہ تک آگیا تھا جہاز بندرگاہ میں رکنے کے بجائے آگے بڑھ گیا اور ساحل پر پڑے ہوئے ریت اور ننگر کے اس انبار پر جا چڑھا جو سمندر کے مد جزر سے اس پہاڑی کے قدموں میں جمع ہو گیا تھا۔ جس پر قبرستان واقع ہے۔ اور جسے ہمارے قصبے کے لوگ نیٹل کہتے ہیں۔

جب وہ جہاز ریت اور ننگر کے انبار پر چڑھا تو ایک زبردست دھماکہ ہوا بادبانوں کے مستول چڑا کر گرے اور رے ٹوٹ گئے اور بلیاں زبردست آواز کے ساتھ عرشے پر گریں اور ساتھ ہی ایک حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ جیسے ہی جہاز ساحل پر چڑھا یکایک ایک کالے رنگ کا جگادری اور خونخوار کتا جہاز کے کسی نچلے کمرے میں سے یوں اچھل کر عرشے پر آیا جیسے اسے توپ میں بھر کر چھوڑا گیا ہو۔ وہ حیرت انگیز پھرتی سے ساحل پر کودا اور بے تحاشہ اس پہاڑی کی طرف بھاگا جس پر قبرستان اور پرانا گرجا واقع ہے۔ اس طرف سے پہاڑی اتنی عمودی ہے کہ اس پر کوئی جانور حتیٰ کہ پہاڑی بکرا بھی نہیں چڑھ سکتا۔ وہ کالا کتا جلد ہی اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اور ایسا

اگر ڈریکولا نے ایک بار پھر اپنی قوتیں حاصل کر لیں تو یہ تمام ڈائنیں ایک بار پھر آزاد ہوں گی۔ ڈریکولا کا اثر دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور وہ کئی صدیوں سے زندہ تھا کئی دفعہ ہم نے یقین کر لیا کہ وہ مردہ ہو گیا لیکن تبھی وہ زندہ ہو کر واپس آ گیا۔ اور ہر دفعہ اس نے اپنا اثر دور دور تک پھیلا کر گویا اپنی لعنتی حکومت قائم کر لی۔

شینڈور خاموش ہو کر ڈائری کے ایک صفحہ پر جھک گیا اور چند ٹائپوں کے توقف کے بعد بولا۔

دس برس پہلے ہم نے یقین کر لیا تھا کہ ڈریکولا کا خاتمہ ہو گیا لوگوں نے مذہبی رہنماؤں نے اور حکومت نے بڑی کوششوں سے تلاش کر کے ایک ایک ڈائن اور ڈریکولا کے ایک ایک ساتھی کا خاتمہ کر دیا تھا اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا تھا یہاں تک کہ صرف ڈریکولا باقی رہ گیا تھا۔۔۔۔۔ دس برس پہلے چند جبالے انگریزوں نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا لیکن۔۔۔۔۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ آخری رسوم اوانہ کی گئی تھی شاید اس کے سینے میں کھوٹا نہ ٹھونکا گیا۔ چنانچہ وہ لوگوں کی نظر کے سامنے مرنے لگا لیکن اس کا خاتمہ نہ ہوا اور وہ انتظار کرتا رہا۔۔۔۔۔ ان شرائط کے پورا ہونے کا انتظار کرتا رہا جو ایک بار پھر اسے زندہ کر دیں گی اور تمہارے بد قسمت بھائی تھے جنہوں نے یہ شرائط پوری کر دیں اور آخر کار یہ مردہ جس کا نام کونٹ ڈریکولا ہے، ایک بار پھر اپنی قبر میں سے نکل آیا۔“

شینڈور نے جو کچھ کہا تھا اس کی حقیقت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی چنانچہ ہارلس اس سے نظر نہ ملا سکا تھا۔ فادر شینڈور نے جو کچھ کہا تھا وہ یقیناً جھوٹ نہ تھا۔ ہارلس شینڈور کے پیچھے الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان کتابوں میں اس عذاب کی پوری داستان محفوظ تھی جو صدیوں سے اس علاقے پر ڈریکولا اور اس کی ”دہنوں“ کی شکل میں نازل ہوا تھا۔

چنانچہ جب تک وہ مزید لڑکیوں یا مردوں یا بچوں کا خون نہیں پی لیتا اس کے روپ بدلنے کی قوت عود نہیں کر سکتی۔“

چارلس کانپ گیا۔

”میری بھابی۔۔۔۔۔“ اس نے کہا۔

”آپ کی بھابی اب اس عفریت کی دہن بن چکی ہیں۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ کی بھابی بھی اب ڈائن ہیں۔ ڈریکولا جس لڑکی کا خون پیتا ہے وہ ڈائن بن جاتی ہے۔“

”میرے خدا!“ چارلس نے مردہ آواز میں کہا۔ ان باتوں کو میں وہی دماغ کی ایچ سمجھے ہوئے تھا۔“

فادر شینڈور نے گھوم کر اور ہاتھ برسھا کر اپنے پیچھے والی الماری میں سے ایک مجلد کتاب کھینٹ لی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ چارلس نے دیکھا کہ یہ کوئی چھپی ہوئی کتاب نہ تھی بلکہ نہایت صاف خط میں لکھی ہوئی ایک ڈائری تھی۔

”کاش کہ یہ باتیں وہی دماغ کی ایچ ہی ہوتی“ شینڈور نے کہا۔

”لیکن یہاں کاربہما میں ہم ویسپائز کو دیو مالا کی کہانی اور توہم پرستی کہہ کر اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ مسٹر چارلس ہمارے زمانے کے ماضی قریب میں یہ عفریت جو آپ کو دیو مالا کا ایک کردار معلوم ہوتا ہے ایک ٹھوس حقیقت تھا لیکن ہمیں امید تھی کہ آئندہ ہمارے یہاں ویسپائز نہ ہوں گے اس لعنتی طریق کے سوتے خود ڈریکولا سے پھوٹے ہیں۔ خود اس کی شیطانی کارستانیوں کی وجہ سے کئی بے گناہ شیر خوار بچے غائب ہوئے اور کئی معصوم لڑکیاں ڈائنیں بنیں۔ آپ نے جنگل میں نیلے نیلے شیلے دیکھے ہوں گے۔ یہ ڈائنیں تھیں لیکن ڈریکولا کے بعد ان کا زور ختم ہو گیا۔“

اور چارلس نے دانت پس کر کہا۔

”میرا بھائی مرچکا اور اس کی بیوی ڈائن بن گئی چنانچہ ڈریکولا کو قتل کرنا اب میرا فرض ہو جاتا ہے۔“

”مسٹر چارلس! آپ ڈریکولا کو قتل نہیں کر سکتے۔“

”قتل نہیں کر سکتا! کیوں؟“

”اس لئے کہ وہ مردہ ہی ہے۔ زندہ مردہ“

”تو پھر۔۔۔“

”اے قتل نہیں کیا جاسکتا البتہ اسے قتل کیا جاسکتا ہے، تلف کیا جاسکتا ہے۔ میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ دس برس پہلے چند جیلے انگریزوں نے ڈریکولا کو قتل کر دیا تھا۔ لیکن اس کا خاتمہ نہ کیا تھا تو اس سے میری مراد یہی تھی کہ اسے تلف نہ کیا گیا تھا۔“

”تو اسے تلف کسی طرح کیا جاسکتا ہے؟“

”مختلف طریقے ہیں۔“

”مثلاً؟“

”پہلے تو یہ سمجھ لو کہ ڈریکولا رات کے وقت ہی شکار کی تلاش میں نکلتا ہے اور دن کے وقت وہ اپنی قبر یا تابوت میں لیٹا رہتا ہے اور اس وقت وہ مجبور اور بے بس ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ دن کے وقت اس کا بھٹ اور قبر تلاش کر لیا جائے اور پھر اس کے یعنی ڈریکولا کے سینے میں اس طرح کھونٹا ٹھونک دیا جائے کہ وہ اس کے دل کے آپار ہو جائے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے سورج کی شعاعوں کے سامنے براہ راست ڈال دیا جائے اس کے علاوہ بتا پانی اسے غرق کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ بہت قریب ہو جائے تو صلیب اسے جلا کر خاکیر کر سکتی ہے۔ لیکن وہ کبھی صلیب

کے قریب نہ آئے گا۔ مطلب یہ کہ ڈریکولا فانی نہیں ہے۔“

”یہ تو بڑے آسان طریقے ہیں۔“

”جی نہیں۔ بلی کی کھال اوڑھنی ہو تو پہلے اسے پکڑنا پڑتا ہے، چکاؤر کے بازو اسی وقت نوچے جاسکتے ہیں جب وہ آپ کے ہاتھوں میں ہو۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”مسٹر چارلس! میرے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا کہ بادی لائفر میں معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف یہ کام نہ صرف بہت مشکل بلکہ بے حد خطرناک بھی ہے۔“

”خطرناک کیسے ہے؟“

”ایسے کہ چند دوسرے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی مدد کریں گے۔“

”یعنی دوسرے ویپار؟“

”جی نہیں بلکہ ہماری آپ کی طرح عام انسان جو کسی ایسے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو۔۔۔“

سلا

”نعر ڈریکولا میں مختلف خدمات انجام دیتے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ہیں جو ویپار نہیں ہیں لیکن کسی خاص وجہ سے۔۔۔ اور یہ وجہ اب تک سمجھ میں نہیں آسکی۔۔۔“

”وہ ڈریکولا کے فرماں بردار اور اس کے زیر اثر ہیں۔ جیسے ڈریکولا کا ملازم۔۔۔“

”کیوں؟“

”ہاں وہ بھی۔ انہیں لوگوں میں سے ایک ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے یہ آخری دن برس تھر ڈریکولا میں اسی موقع اور وقت کے انتظار میں گزارے ہوں گے جو آپ

اور ڈائنا ہیملن کی طرح ایک ڈائن بن جاتی اور پھر وہ خود دو سروں کا خون پیتا اور ڈائن بچوں کو چراتی کہ ان کے خون سے اپنی پیاس بجھائے اور خدا جانے کب تک شاید قیامت تک یا اس وقت جب تک کوئی ان دونوں کو قاتل نہ کر دیتا ان کی یہ زندگی جو قطعی زندگی نہ تھی قائم رہتی۔

چارلس کے ماتھے سے ٹھنڈا ہینہ ٹپکنے لگا۔

”ہیں۔ میں۔ اپنی بیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ہاں، ہاں۔“ قادر شینڈور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں چاہتا تھا کہ ہم آپ تفصیل سے گفتگو کر لیں اور اس عرصہ میں آپ کی بیوی کو مزید آرام کرنے کا موقع مل جائے۔“

”لیکن میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ شکر اور پریشان ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ سب ٹھیک ٹھاک نہیں ہے۔ چنانچہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے کہ آپ کی بیوی زندہ ہیں اور فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔“

چنانچہ وہ دونوں مطالعہ گاہ میں سے نکل کر محرابی غلام گردش میں چل پڑے۔ یہ گزر گاہ خاموش اور دیران سی تھی اور چارلس کے دل پر اویسی اور افسردگی چھاتی جاری تھی، لیکن ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک راہب نے مسکرا کر چارلس کی طرف دیکھا، تو اس کی ڈھارس بندھی یہ اس شخص کی مسکراہٹ تھی، جو بنی نوع انسان سے محبت کرتا تھا، اور تمام تر ہمدردیاں ان پر نچھاور کر دیتا تھا۔ اور اس کے فحش کوئی چیز نہ طلب کرتا تھا اور چارلس نے محسوس کیا کہ یہ خائفہ ایک محفوظ قلعہ تھا اس منحوس قصر سے زیادہ محفوظ جو ایک پہاڑی پر کھڑا ہوا تھا اور جو قصر ڈریکولا کے نام سے مشہور تھا۔

قادر شینڈور نے ایک حجرے کا دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر چارلس کو

نے گزشتہ رات میا کر دیا۔۔۔۔۔ یعنی اپنے آقا کو دوسری زندگی بخشنے کا موقع۔

”لیکن اب کیا ہو گا جب کہ اسے دوسری زندگی بخشی جا چکی ہے؟“

قادر شینڈور نے کتاب بند کر کے اس پر یوں سر جھکا دیا جیسے وہ کتاب مقدس ہو۔

”یہ تو ہم نہیں جانتے کہ اب کیا ہو گا۔ اگر جانتے ہوتے تو۔۔۔۔۔“

”تو کیا ہوتا؟۔۔۔۔۔“ چارلس نے بے تابی سے پوچھا۔

”تو ہم کم سے کم یہ معلوم کر سکتے کہ اب کون سا قدم اٹھایا جائے ہمیں کوشش

کرنی چاہیے کہ یہ دیا اس علاقے میں نہ پھیلنے پائے ڈریکولا زندہ ہو چکا ہے اور اگر

جلد ہی اس کا خاتمہ نہ کر دیا گیا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ اگر اس نے

اپنے مافوق الفطرت قوتیں حاصل کر لی ہیں، اگر اسے زیادہ سے زیادہ خون مل گیا۔ تو پھر

ویہ پائر پیدا ہوں گے اس کی وجہ سے عورتیں ڈائیس بنیں گی اور پھر ہمارے بنائے ہوئے

نہ بنے گا۔

”مسٹر چارلس!“ قادر شینڈور نے بڑی سنجیدگی سے اضافہ کیا ”ویہ پائر حیرت

انگیزی اور تیزی سے بڑھتے اور پھیلتے ہیں۔ انسانوں کے مقابلہ میں سنگی اور جانوروں

کے مقابلے میں دگنی تیزی سے ان کی نسل میں اضافہ ہوتا ہے۔

اور چارلس کو کونٹ ڈریکولا کی شدید پیاس کا بلکہ خون کے ہو کے کا خیال آیا۔

اور ایک بار پھر تصور کی نظر سے اس نے اپنے بھائی کی لاش دیکھی جو وہاں قصر ڈریکولا

کے تہ خانے میں ایک صندوق میں ٹھونس ہوئی تھی، سرکئی اور نچرئی ہوئے لاش اس

کے بھائی کے خون نے اس عفریت کو زندگی بخشی تھی اور پھر وہ ہیملن کا خون پی چکا تھا

اور ہیملن ڈائن بن چکی تھی۔۔۔۔۔ چارلس کانپ گیا۔۔۔۔۔ میرے خدا! خود وہ اور ڈائنا اس

جہاں کے کسی قدر قریب تھے جو موت نہ تھی۔۔۔۔۔ جو زندگی بھی نہ تھی۔۔۔۔۔ اگر ڈریکولا

نے اس کا اور ہیملن نے ڈائنا کا خون پی لیا ہو تو وہ ڈریکولا کی طرح ایک لعنتی ویہ پائر

اشارے سے اندر جانے کہ کہا۔

ڈانٹا ایک معمولی چارپائی پر ایک کھردرا کبل اوڑھے لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اس کے ماتھے پر خون دھو کر صاف کر دیا تھا لیکن اس کا رنگ وہ اب بھی مردے کی طرح زرد تھا۔ اس کی یہی رنگت دیکھ کر چارلس وہاں چوراہے کے قریب جھنگل میں اس کی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔ اور یہ رنگت انتہائی سکون کی رنگت تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ بے جان بھی شاید ان دونوں لفظوں کا مطلب ایک ہی تھا۔ شاید اس دنیا میں سکون نہ مل سکتا تھا سکون تو قبر کے اس پار ہی میسر آ سکتا تھا۔ چارلس کانپ گیا لیکن موت بہتر تھی ہاں اس سے بہتر تھی کہ انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہے اس دھندلی دنیا میں زندہ رہے جہاں عفریت اور ڈانٹیں تھیں جو ان کی منحوس اور بھیاںک دنیا تھی بے شک اس سے موت بہتر تھی کہ انسان زندہ مرد بن جائے۔ اور ڈانٹا شاید وہ اسی دنیا میں پہنچ گئی تھی، اس کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ وہ چارلس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اس نے گھوم کر پیچھے کھڑے ہوئے فادر شینڈور کی کلائیاں پکڑ لیں اور تقریباً چیخ کر کہا۔

”آپ نے تو کہا تھا کہ میری بیوی“

”آپ کی بیوی کی حالت اطمینان بخش ہے۔“ فادر شینڈور نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”چوبیس گھنٹے اور آپ کی بیوی پوری طرح صحتیاب ہو چکی ہو گی۔“

”کیسے یقین کر لوں!“

”آپ کو مجھ پر اعتبار ہے یا نہیں؟“

چارلس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر یقین کیجئے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا اور یقین کیجئے کہ فکر کی کوئی بات

نہیں ہے۔ خطرہ ٹل گیا اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہوش آجائے گا۔“



چارلس کی گرفت شیڈور کی کلائیوں پر ڈھیلی پڑ گئی اس کا سر شرم اور ندامت سے جھک گیا۔ اور اس کی انگلیوں نے شیڈور کی کلائیوں کو چھوڑ دیا اور اس کے ہاتھ تقریباً بے جان سے ہو کر اس کے دائیں بائیں لٹک گئے۔

”آئیے“ قادر شیڈور نے کہا۔

دونوں حجرے سے باہر آ گئے اپنی بیوی کو یوں بے سدھ پڑے دیکھ کر اور اس کے مردے کی سی رنگت دیکھ کر چارلس کے دل کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ اسے قادر شیڈور پر اعتبار تھا اور اس نے ڈانٹا کے روبہ صحت ہونے کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس پر چارلس کو یقین تھا تاہم وہ اپنی فکر و پریشانی پر قابو حاصل نہ کر سکا تھا۔

حجرے سے باہر آ کر قادر شیڈور نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور وہ دونوں پھر محرابی گزرگاہ میں چل پڑے ایک راہب گزرگاہ کے انتہائی سرے پر سے ان کی طرف آ رہا تھا۔ یہ برادر مارک تھا وہی جس نے چارلس سے اس وقت گفتگو کی تھی جب اسے، یعنی چارلس کو ہوش آیا تھا۔

”قادر! لڈوگ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔“ برادر مارک نے قریب آ کر کہا۔

قادر شیڈور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تو برادر مارک پلٹ کر جس طرح آیا تھا۔ اسی طرح خاموش اور متوازن قدموں سے چل دیا اور چارلس نے اپنی دل میں رشک کی ایک لہری محسوس کی، کس قدر خاموش اور پرسکون زندگی تھی ان لوگوں کی! اور چارلس نے سوچا کہ جب وہ اس خانقاہ سے چلا جائے گا اور جب وہ لندن کی روشنیوں

لٹوگ طویل القامت شخص تھا اور اس کی آنکھیں جلتی ہوئی تھیں، جیسے کسی بھیڑیے کی آنکھیں ہوں۔ اس کی ایک ایک حرکت سے اعصابیہ بھان اور سمجھ میں نہ آنے والی اندرونی بے چینی عیاں تھی۔ بظاہر وہ پرسکون معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ایک طرف پڑے ہوئے برش، رنگ کیواس کے ٹکڑے، کپڑوں کی دھجیاں اور دوسری بے

”یہ بھی آپ ہی کی طرح ایک مسافر تھا ایک رات قصر ڈراکیولا کے قریب یہ مجھے مل گیا تھا اس نے یا تو کوئی انوکھی بات یا کوئی بھیاںک چیز دیکھی تھی یا شاید کوئی خوفناک تجربے سے دوچار ہوا تھا۔ بہر حال اس کا دماغ چل گیا۔ اس کی یادداشت ختم ہو گئی اور میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے خود لڈوگ کے حق میں یہ اچھا ہی ہوا۔ میں اسے یہاں لے آیا اور پچھلے بارہ برس سے وہ ہماری خانقاہ میں ہی مقیم ہے۔ بے حد صابر اور راضی برضا قسم کا انسان ہے، یہ لڈوگ کو کسی بھی شیطانی قوت نے اسے اپنے اثر میں کیوں نہ لے لیا ہو، وہ اب اس اثر کو جھٹک چکا ہے اور اس شیطانی قوت کی گرفت سے آزاد ہے اب وہ ایک ہوشیار اور عمدہ دستکار ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا یہی شغل ہے اور دستکاری کی طرف اس کی یہی محویت ہے جس نے اس کی ان یادوں کو مٹا دیا ہے جو اس کے دماغ پر نقش ہو چکی تھیں۔ ان واقعات کی یادوں کو جن سے قصر ڈراکیولا کے قریب یا خود قصر میں دوچار ہوا تھا۔ اب وہ پرسکون اور مطمئن ہے اور اس شیطانی اثر سے آزاد جو کبھی اس کے لئے اذیت ناک تھا۔“

چارلس نے اس داغ کو پہچان لیا۔ ایک موٹی سی پگلی ہوئی مکھی تھی یہ۔

اور اب لڈوگ کو چارلس اور فادر شینڈور کی حجرے میں موجودگی کا احساس ہوا۔ اس کے باوجود وہ بڑی عیاری سے ان کی موجودگی کو ٹالتا رہا وہ بدستور بے حس اور بے پروا رہا۔ اس نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تک نہیں صاف ظاہر تھا کہ وہ جب تک چاہے گا۔ ان کی طرف نہ دیکھے گا اور اس طرح ان کی موجودگی کا اقرار نہ کرے گا۔ کسی کے بھی وجود کا اقرار نہ کرنے کی یہ ترکیب بڑی ہی مکارانہ تھی۔

لڈوگ کے ہونٹ مسکراہٹ کی صورت کھینچ گئے اور چارلس کو اس بھیرپے کی طرح نظر آیا جس کی چالاکی مگر آسانی سے اپنا شکار حاصل کر لیا ہو۔ لڈوگ کی شہادت کی انتہی آگے بڑھی اور پگلی ہوئی مکھی کو لٹھکانے لگی۔ میز کے ایک کونے پر دوسری مکھیوں کا جو سب کی سب مردہ اور پگلی ہوئی تھیں، ایک ننھا سا انبار تھا۔ لڈوگ نے تازہ پگلی ہوئی مکھی کو لٹھکا کر اس انبار میں ڈال دیا۔

فادر شینڈور آگے بڑھا۔

دفعۃً لڈوگ نے اپنے ایک ہاتھ کی ہتھیلی کا پیالا بنا کر میز کے کنارے عین نیچے رکھا، دوسرے ہاتھ سے میز کی سطح پر جھاڑوسی پھیر کر اس کے کنارے پر رکھی ہوئی مکھیوں کو سمیٹ کر ہتھیلی کے پیالے میں ٹپکا دیا، پھر اس کا یہ ہاتھ بلند ہو کر منہ تک پہنچا اور چشم زدن میں یہ مردہ مکھیاں اس کے منہ میں تھیں لڈوگ جلدی جلدی منہ چلانے لگا۔ اور انہیں چبا کر نگل گیا۔

اور اب اس نے فادر شینڈور اور چارلس کی موجودگی کا اقرار کرتے ہوئے سر کے اشارے سے انہیں سلام کیا۔

”لڈوگ! یہ کیا؟“ مکھیاں؟“ فادر شینڈور نے کہا۔

”لڈوگ نے مسرت سے سر ہلایا۔

مصرف چیزوں کا انبار لڈوگ کو پتلیوں کی صف میں سے نکال کر کاریگوں کے گروہ میں لا کھڑا کرتا تھا۔ ایک قہنجی دراز میز پر ایک چوتھائی صفحہ جڑا ہوا تھا اور اس وقت لڈوگ برش ہاتھ میں لئے بڑی نزاکت اور مہارت سے اسی صفحہ پیشنگ کر رہا تھا وہ اپنی عجیب آواز میں کوئی سمجھ میں نہ آنے والا گیت گارہا تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ چٹان کی طرح مستحکم تھا، چنانچہ اس نے صفحے پر جو لکیر پرش سے کھینچی تھی ہو ساہول کی ڈوری کی طرح سیدھی اور صحیح تھی۔

چارلس اور شینڈور حجرے میں داخل ہوئے تو لڈوگ نے اپنے آپ سے کہا
”بے حد شاندار..... ہم..... میرا تو یہی خیال ہے..... یعنی حقیقت میں بے حد عمدہ۔“

اس نے برش رکھ دیا اور اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا، پھر ذرا جھکا کر یوں ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھایا۔ جیسے تلوار جھونک رہا ہو، کچھ دیر تک اس کا بازو ہوا میں اٹھا رہا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے نیچے چلا اور اس کی ہتھیلی دھڑام سے میز پر آ پڑی۔ ساتھ ہی لڈوگ کے بشرے کے جذبات میں تغیر ہوا، پہلے وہ ایک چسوی کا چہرہ تھا۔ لیکن اب وہ ایک عیار شیطان کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے کے پٹھے کھینچ گئے تھے۔ نقوش اینٹھ گئے تھے اور آنکھوں میں صحیح معنوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔

وہ آنے والوں کی طرف ذرا بھی متوجہ نہ ہوا۔ وہ انہیں بھول چکا تھا۔ وہ ہر چیز کو بھول چکا تھا۔ ہر شے کے وجود سے بے پروا ہو چکا تھا اور فکر تھی تو صرف اس چیز کی جو اس کی ہتھیلی اور میز کی سطح کے درمیان دبئی ہوئی تھی۔ اب اس کے بشرے سے فتمندی کا جذبہ عیاں تھا۔ ایک ماہر اور عیار شکاری کی طرح اس نے اپنی ہتھیلی کو ایک کنارے پر سے ذرا اوپر اٹھایا اور سر جھکا کر اس میں جھانکنے لگا اور پھر آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اٹھالیا..... میز کی سطح پر ایک کالا داغ نظر آرہا تھا۔

”دوا بھی ہے اور ناشتہ بھی۔“ وہ بولا۔

”دوا اور ناشتہ!“

”جی ہاں فادر، لیکن جلد ہی یہ مختصر سا ناشتہ حکم سیر کر دینے والا ڈزین جائے گا۔“ چارلس کو حلقی ہو رہی تھی، آنتیں الٹ رہی تھیں لیکن فادر شینڈوریوں بے تعلق اور لاپرواہ رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کا لہجہ اب بھی دوستانہ اور آواز ٹھہری ہوئی تھی۔

”مجھ سے کہہ گیا ہے کہ تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔“

”تشریف رکھیے۔“ اس نے کہا اور حیرت انگیز قوت سے قریب رکھی ہوئی وزنی سچ کھینٹ کر ایک طرف کر دی۔

”آپ بھی جناب تشریف رکھیے، اس نے چارلس سے کہا۔

وہ اٹھا اور میز کا چکر لگا کر دوسری طرف آگیا۔ اس کے جڑے اب بھی چل رہے تھے۔ اور پچی کچی مکھیوں کو پیس رہے تھے۔ چارلس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ لڈوگ کی طرف نہ دیکھے لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اول تو اس لئے کہ اس کے مضبوط جبروں کی چلتی ہوئی چکی نے جو مردہ مکھیوں کا آٹا بنا رہی تھی اسے مسحور کر رکھا تھا اور پھر اس شخص کی آنکھوں میں کوئی عجیب قوت تھی جس نے چارلس کی نظر کو جکڑ رکھا تھا۔

”اب۔۔۔۔۔ لڈوگ نے کہا۔“ میں تیسری جلد کا سرورق مکمل کر چکا ہوں“

اس کی آواز میں کامیابی کی ایسی جھلک تھی کہ چارلس کو بھی شک ہوا کہ لڈوگ کے اس اعلان پر فیملی بگل چلا اٹھیں گے اور خوشی کے شادیاں بچتے لگیں گے۔

اس نے ایک چڑی کاغذ اٹھا کر آنے والوں کے سامنے پھیلا دیا خود ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس پر بنائے ہوئے ڈیزائن کو تعریفی نظروں سے دیکھنے اور سر ہلا کر خود اپنے فن کی داد دینے لگا چارلس آرٹ اور فن کاغذ نہ تھا، لیکن وہ بھی صاف عمدہ اور موتیوں

جیسے حروف اور حاشیے پر بنی ہوئی عمدہ اور سنہرے ڈیزائن کی دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ کئی دن بلکہ کئی ہفتہ اس باریک اور دیدہ ریزی کے کام کی نذر ہو گئے ہو گئے۔

”کیا خیال ہے“ لڈوگ نے بتابی سے پوچھا۔ ”نقیں اور عمدہ یا محض شاندار؟“ فادر شینڈور آپ ہی آپ مسکرایا۔

”بے حد نقییں اور بے حد عمدہ۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے مسٹر چارلس؟“ ”بے حد حسین۔“

لڈوگ نے سر ہلا کر کاغذ ان دونوں کے سامنے سے گھسیٹ لیا

”ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔ ”اب تم جاؤ۔ جب مجھے ضرورت ہوگی۔ تو بلا لوں گا۔“

وہ دونوں اٹھ کر باہر آگئے۔ دروازہ کے باہر برادر اور مارک کھڑا ہوا تھا، اس نے فوراً ہی دروازہ بند کر کے اس میں قفل ڈال دیا۔

”یہ حجرہ۔“ چارلس نے خدا جانے کیوں بے چینی محسوس کر کے دل ہی دل میں کہا۔ ”قید خانہ کا کمرہ بن گیا ہے“

اور پھر اس نے فادر شینڈور سے پوچھا۔

”فادر! یہ احتیاط کیوں؟“

”زیادہ تر تو لڈوگ پر سکون رہتا ہے۔“ فادر شینڈور نے چلتے ہوئے جواب دیا۔

”اور زیادہ تر وقت یہ بے ضرر بھی ہے لیکن کبھی کبھی اچانک پھٹ پڑتا ہے۔“

”یعنی؟“

”یعنی اس پر جنون کا دورہ سا پڑتا ہے پچھلی دفعہ جب اس پر دورہ پڑا تھا۔ تو اس

نے ایک برادر پر حملہ کر کے اس کی کھوپڑی پھاڑ دی تھی۔“

”میرے خدا! تو وہ برادر۔۔۔۔۔؟“

دھنسا" وہ خاموش ہو گیا، ایک قدم دروازے کی طرف بڑھا، اس کے ماتھے پر سولیس ابھر آئیں، اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔
 "نہیں۔ صورت حال ایسی ہے کہ ہم خانقاہ کے دروازے نہیں کھول سکتے اور کھولنے بھی نہیں چاہئیں۔ کسی کے لئے بھی نہیں۔ خواہ وہ دنیا کے دوسرے سرے سے ہی کیوں نہ آیا ہو۔"

برادر مارک نمایاں طور پر چونکا۔

"ہم جب تک اس مسئلے پر اطمینان بخش طور پر بحث اور پورے معاملے پر ہر پہلو سے غور نہیں کر لیتے تب تک ہمیں کسی اور طرف متوجہ نہیں ہونا ہے" قادر شینڈور نے کہا "اور خیال رہے کہ کوئی چیز باہر سے اندر نہ لائی جائے کسی صورت میں نہ لائی جائے نہ قصداً اور نہ اتفاقاً برادر مارک! چھکڑے والے سے کہہ دو کہ ہم اسے خانقاہ میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ البتہ وہ باہر جہاں چاہے قیام کر سکتا ہے۔ اس کا کھانا باورچی خانے سے بھجوا دیا جائے گا۔"

دنیا کے اس حصے میں شام کا دھندلا دھنسا "چھا جاتا تھا بالکل اس طرح جیسے سمندر میں مد کے بعد فوری طور پر جزر شروع ہو جائے۔ سورج کے پہاڑیوں کے عقب میں باتے ہی اس وادی پر اندھیرے کی چادر پھیلنے لگتی جو رفتہ رفتہ سے زیادہ گہری ہونے لگتی اور ارد گرد پھیلے ہوئے جنگلات اس سرعت سے بڑھتے ہوئے اندھیرے کو اذر کی گاڑھا کر دیتے۔

مطالعہ گاہ میں پہنچ کر قادر شینڈور نے ایک لالٹین جلائی اور اپنی میز پر رکھ دی۔
 ل طرف سے فرصت پا کر وہ دو جام اور ایک صراحی لے آیا۔

"یہ مقامی شراب ہے" قادر شینڈور نے شراب چارلس کے پیالے میں اتار دیا۔
 "کما" اور یہ اس علاقے کی بہترین شراب ہے۔"

"شکر ہے کہ بچ گیا۔" آؤ بھی، ہمیں بہت سے مسائل پر بحث کرنی ہے۔"

ایک ایک خانقاہ کی گزر گاہیں گھنٹی کی آواز سے گونج اٹھیں، گھنٹہ خاموش ہو گیا اس کی آواز مدھم ہو کر ڈوب گئی۔ تو گھنٹہ پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے دو دھنکے بجایا گیا۔ چارلس نے سوچا کہ عبادت کا وقت آگیا تھا اور گھنٹے کی یہ آواز راہبوں کو عبادت کے لئے بلارہی تھی، بہر حال اسے گھنٹے کی یہ آواز بڑی ہی بے سری اور بھدی معلوم ہوئی۔
 برادر مارک جوان دونوں کے پیچھے اور چند قدم دور چل رہا تھا۔ ایک دم سے اپنی رفتار تیز کر کے آگے بڑھا اور ان کے قریب سے لکلا چلا گیا۔

چارلس اور قادر شینڈور خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے گزر گاہ کے اس موڑ پر پہنچ گئے جس کے عین سامنے ایک مختصر سی ڈیوڑھی تھی اور اس کے سرے پر اسکا بڑا بے ڈھنگا مگر مضبوط دروازہ تھا۔ برادر مارک نے اس دروازے کے قریب پہنچ کر کواڑ میں بنی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی کھولی اور دروازے کے باہر کسی سے کچھ پوچھنے لگا۔
 قادر شینڈور نے رفتار دھیمی کر دی کہ معلوم کرے برادر مارک کیا کہتا ہے اور اب چارلس نے دیکھا کہ وہ بے سری آواز گھنٹے کی نہیں بلکہ اس غیر معمولی طور پر بڑی اور زنگ آلود گھنٹی کی تھی جو دروازے کے ماتھے پر لگی ہوئی تھی۔

برادر مارک ان دونوں کی طرف گھوم گیا۔

"کیا بات ہے برادر؟" قادر شینڈور نے پوچھا۔

"باہر ایک چھکڑے والا کھڑا ہے" برادر مارک نے جواب دیا "اور وہ سہ پہر اور رات یہاں گزارنے کے لئے درخواست کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ بہت دور سے آیا ہے بے حد تھکا ہوا ہے۔"

قادر شینڈور نے کہا۔ "ہماری مسمان نوازی ضرب الشل ہے اور خانقاہ کے دروازے ہر مسافر کے لئے کھلے ہیں اور۔۔۔۔۔"

اور انہوں نے پیالے اپنے ہونٹوں سے لگائے۔

شراب غیر معمولی طور پر تیز تھی چنانچہ اس کی تلخی چارلس نے اپنے دانتوں کی رتوں اور زبان پر شدت سے محسوس کی لیکن اس کے حلق سے نیچے اترتے ہی اس کی رگ رگ میں ایک گرمی سی دوڑ گئی اور اس نے جلی خوں ایک حد تک ذائل ہو گیا جو اندھیرا اترتے ہی اس کے دل پر چھانے لگا تھا۔

چارلس نے کہا..... ”اگر وہ..... وہ..... ڈرا کیولا آج رات اپنی قبر سے نکل آیا.....“

”وہ زندہ ہو چکا ہے۔ مسٹر چارلس چنانچہ وہ اپنی قبر میں سے ضرور نکل آئے گا۔ اسے شکار کی تلاش ہوگی کیونکہ وہ اپنی تمام کچھلی قوتیں حاصل کرنے کے لئے بے قرار ہو گا تاکہ وہ ایک بار پھر جب چاہے بھیڑیا یا چکا ڈھن کر خون چوس سکے۔“

”اور اگر وہ یہاں.....“

”اطمینان رکھو وہ یہاں نہیں آسکتا۔ خیر تو اب مناسب ہو گا کہ ہم اپنے عمل کا پورا نقشہ مرتب کر لیں۔“

”فرمائیے۔“

”آپ نے کہا تھا کہ ڈرا کیولا کو فنا کر دینا آپ کا فرض ہو گیا ہے۔ یا آپ اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔“

”جی“

”لیکن مسٹر چارلس چونکہ میں ایک راہب ہوں اس لئے آپ کے اس جذبے کی تعریف نہیں کر سکتا اور نہ ہی آپ کو انتقام یا سزا دینے کا مشورہ دے سکتا ہوں۔ یہ کام انسانوں کا نہیں ہے۔ انتقام لینا اور سزا دینا خدا کے کام ہیں۔ بہر حال اب اگر آپ پورے مسئلے پر غور کر چکے ہیں اور جان چکے ہیں کہ ڈرا کیولا ایک عفریت ہے اور

اس کے بعد آپ نے یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا ہے تو.....“

چارلس نے فنی میں سر ہلایا۔

”فادر شینڈور! میں اس وقت تک یہاں سے نہ جاؤں گا جب تک کہ وہ دوزخی نہت فنا نہیں ہو جاتا۔“

فادر شینڈور نے ”بہت اچھا“ کے سے انداز میں سر ہلایا۔ اس کے بشرے سے ابرو اتار تھا جیسے اسے چارلس کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا ہے۔

تاہم چارلس کو احساس ہوا کہ فادر شینڈور کو اس سے اسی جواب کی توقع تھی۔ ”جیسی آپ کی مرضی“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”لیکن آپ کی بیوی کو کسی بھی حال میں یہاں نہیں رہنا ہے۔ جب وہ سفر کے قابل ہو جائیں گی تو ہم فوراً ہی انہیں ملتان بھیج دیں گے۔ اور وہاں وہ محفوظ ہوں گی۔ اور ہم خود ان کی طرف سے لیٹن ہو کر یکسوئی سے وہ کام کر سکیں گے۔ جو ہمیں کرنا ہے۔ ہم قصر ڈرا کیولا کا گوشہ نشین چھان ماریں گے۔ اور وہ بھٹ تلاش کر لیں گے جہاں یہ عفریت آرام کرتا ہے۔ پھر اسے تلف کر دیں گے اور اس دفعہ کوئی ایسی لغزش نہ ہوگی جس کی وجہ سے اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا امکان باقی رہے۔“

لیکن ہم اس وقت قصر کی طرف کیوں نہ نہ روانہ ہو جائیں۔

”نہیں مسٹر چارلس۔“

”کیا مشکل ہے اس میں؟“

”گزشتہ رات ایک شکار کونٹ ڈرا کیولا کے ہاتھ میں آکر نکل گیا ہے۔“

”کون شکار؟“

”آپ کی بیوی“

چارلس لرز گیا۔

فادر شینڈور نے غصے سے پھٹکار کر کہا۔

”وہ سب بکواس اور حماقت ہے۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔“

اس علاقے کے لوگوں کی معلومات محدود ہیں اور پھر وہ تو ہم پرست بھی ہیں چنانچہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ویپائر کسی بھی مکان کی دہلیز اس وقت تک نہیں چھلانگ سکتا جب تک کہ اسے اندر نہ بلایا جائے اور یہ بلانے والا مکان کے اندر ہی ہوگا۔ اگر مکان کے اندر والے نے اسے بلالیا، اندر آنے کی دعوت دی تو پھر اگر دنیا کا تمام لسن بھی وہاں ڈھیر ہو تو وہ ویپائر کو نہ روک سکے گا۔“

”اور یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ہم سے کوئی اسے اندر آنے کی دعوت دے۔“

”میرے خیال میں تو یہ ممکن نہیں۔“

فادر شینڈور نے جام دوبارہ بھرے اور وہ آہستہ آہستہ مقامی شراب کی چسکیاں لینے لگے، دونوں خاموش تھے چارلس خود اپنے خیالات میں الجھا ہوا تھا، اور خیالات کا ایک کاررواں تھا جو اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔

فادر شینڈور بھی خاموش تھا اور وہ ان باتوں کو جن سے وہ واقف تھا۔ الگ الگ دلوں میں ذہنی طور پر تقسیم کر رہا تھا۔ ویپائر کی خصوصیات خود ڈراکیولا کی خصلتیں اور اس کی پچھلی سوانح، تصر ڈراکیولا اور اس کے اطراف کے متعلق معلومات وغیرہ وغیرہ۔

دفعہ چارلس اٹھ کھڑا ہوا۔

”فادر! آپ اجازت دیں تو میں اپنی بیوی کو ایک نظر دیکھ آؤں؟“

اس نے کہا ”میں۔۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔۔ او۔۔۔۔۔ اپنا اطمینان کر لیتا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ محفوظ ہیں۔ تاہم آپ ہو۔ آئیے ان کے پاس آئیے۔ میں آپ کو ان

”ڈراکیولا نے انہیں دیکھا تھا“ اس کی حیرانہ نگاہیں نہ صرف ان پر پڑ چکی تھیں بلکہ وہ آپ کی بیوی کی آرنو بھی کر چکا تھا۔“

”آرنو بھی کر چکا تھا! یہ آپ نے کیسے کہا۔ یا فادر؟“ چارلس یقین کرنا نہ چاہتا تھا۔

”ثبوت کے طور پر یہ بات پیش کی جاسکتی ہے کہ آپ کی بیوی کو ہلا پھلا کر بلانے کے لئے اور پھر انہیں پکڑنے کے لئے اس نے خود آپ کی بھابھی کو ذریعہ بنایا جو اس عفریت کی دلہن اور ڈائن بن چکی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود ڈراکیولا آپ کی بیوی کو چھو چکا ہے۔ چنانچہ اب وہ اپنی ہی ملکیت یقین کر چکا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آپ کی بیوی کو حاصل کرنے کے لئے بے قرار ہوگا۔“

چارلس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ خانقاہ کی دیواریں مضبوط اور موٹی تھیں۔ ابتداء میں اسے یہ خانقاہ ایک چھوٹے سے مضبوط اور مقدس قلعہ کی طرف معلوم ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ سوچ رہا تھا اور کانپ رہا تھا کہ کیا اس کی سنگین دیواریں ڈراکیولا کو روک سکیں گی؟

”وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ یہاں نہیں آئے گا؟“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”اس کی امید تو نہیں؟“

”لیکن فرض کیجئے وہ یہاں آگیا تو؟“

”اگر وہ یہاں آ بھی گیا تو خانقاہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔“

اور اسے وہ تمام باتیں یاد آ گئیں جو اس نے کتابوں میں پڑھی تھیں اور سرائے بھی یاد آ گئی جس میں انہوں نے قیام کیا تھا جہاں ان کی ملاقات سے فادر شینڈور سے پہلی دفعہ ہوئی تھی۔

”آپ کا مطلب ہے لسن کے غنچے؟“

کے حجرے کا راستہ دکھا دوں گا۔“

اور وہ مطالعہ گاہ سے باہر نیم روشن گزرگاہ میں چل پڑے اور کچھ ہی دیر بعد ایک حجرے کے دروازے کے سامنے تھے۔

چارلس اگر ہوتا تو اس حجرے تک نہ پہنچ پاتا۔ اور اگر پہنچ جاتا تو اسے پہچان نہ سکتا تھا، کیونکہ گزرگاہیں ایک سی تھیں اور دروازے بھی ایک سے تھے۔ چارلس نے سوچا کہ اس خانقاہ میں کئی دنوں کے قیام کے بعد بھی وہ کسی خاص حجرے کو نہ پہچان سکے گا اور یہ کہ اس خانقاہ کے راہبوں کو یہاں کے راستے اور حجرے کس طرح یاد رہتے ہوں گے۔

ڈائنا کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ لیکن جب چارلس اس پر جھک گیا تو اس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں، پہلے تو وہ چونکی پھر مسکرا کر اپنی باہیں اس کی گردن میں ڈال دیں۔

”چارلس، میرے پیارے“ اس نے کہا۔

”ڈائنا!“

”تمہیں کچھ ہوا تو نہیں!۔۔۔ یعنی۔۔۔ اچھے ہونا؟“

”بالکل۔“ چارلس، چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

قادر شینڈور باہری رک گیا تھا۔ اور وہ اپنے خیالات میں الجھا ہوا اب بھی وہاں کھڑا تھا۔

”ہمیں سب سے زیادہ فکر تمہاری تھی“ چارلس نے کہا ”اور فی الحال سب سے ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ تمہیں تندرست کر دیا جائے کہ تم لندن تک نہ کر سکو۔“

ڈائنا کا چہرہ دیک اٹھا۔

”یعنی گھر؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“

میں گھر پہنچنے کے لئے اس قدر بیتاب ہوں کہ کیا بتاؤں۔ میں جلد از جلد یہاں سے رخصت ہونا چاہتی ہوں۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ جو کچھ ہوا ہے اس سے دور چلی جانا چاہتی ہوں۔“

اس نے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چارلس!“

”ہم۔“

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ سب خواب تو نہ تھا۔ حقیقت تھی نا۔“

”ہاں ڈائنا وہ حقیقت تھی۔ کاش کہ وہ خواب ہوتا۔ لیکن ایک بار تم یہاں سے در چلی جاؤ گی تو پھر۔۔۔“

”ہم کب چل رہے ہیں؟“

چارلس شش دہچ میں پڑ گیا اور پھر چند ثانیوں کے توقف کے بعد بولا۔

”ہم نہیں، صرف تم۔“

”کیا مطلب؟“

”ڈائنا! میں تمہارے ساتھ نہ جاؤں گا۔ کم سے کم فی الحال نہ جاسکوں گا۔“

”کیوں؟“

”یہاں مجھے ایک اہم فرض انجام دینا ہے۔“

”تم وہاں اس منحوس قصر میں دوبارہ تو نہیں جا رہے؟“ ڈائنا نے تقریباً چیخ کر پچھا۔

”میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے ڈائنا۔“

دوڑ کر ڈانٹا کے پاس جائے اور اسے اپنے سینہ سے لگا لے۔
 ”ہاں ہوگی، لیکن ساتھ ہی ساتھ میں سمجھتا ہوں وہ ایک وقار اور فرماں بردار
 بیوی بھی ہے۔“

چارلس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
 ”میری مانیجے اور آج آپ بھی جلد ہی سو جائیے۔“ قادر شینڈور نے بات کو گویا
 لہجہ تک پہنچاتے ہوئے کہا۔

”آپ بہت زیادہ تھکے ہوئے ہیں چاہے خود آپ کو اس کا احساس نہ ہو۔“
 ”احساس کیوں نہیں ہے قادر؟ لیکن۔۔۔۔۔۔“

”آپ فکر نہ کریں اور اطمینان سے سو جائیں۔ بے فکر ہو کر۔ ہمارے دروازے
 مضبوطی سے بند ہیں۔ آپ اور آپ کی بیوی محفوظ ہیں۔“

”آج رات کوئی دشمن اس خانقاہ میں قدم نہ رکھ سکے گا۔“
 باہر رات کی دھند پھیل چکی تھی۔ خانقاہ کی کمریوں کے شیشے بھی دھندلا گئے

تھے۔ ایک کمری کے شیشے پر بھوری بھوری انگلیاں رنگ رہی تھیں، کوئی باہر کھڑا
 کمری کے شیشے کو ناخنوں سے یوں کھرچ رہا تھا جیسے وہ شیشہ نہیں کاغذ ہو۔ کچھ دیر کی

ناکام کوشش کے بعد وہ بھوری انگلیاں شیشے پر سے ہٹ گئیں۔

خانقاہ کے دروازے اور کمریاں مضبوطی سے بند تھیں۔

چنانچہ خوف کی کوئی بات نہ تھی۔



”نہیں۔ نہیں۔ میں تمہیں وہاں نہ جانے دوں گی چارلس تم وہاں نہ جاؤ گے۔“

”اس کے متعلق ہم کل صبح تفصیل سے گفتگو کریں گے۔“

”نہیں۔ کل نہیں۔ اسی وقت اور ابھی۔“

چارلس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ڈانٹا اس سے لپٹ گئی۔

”نہیں۔ میں تمہیں نہ چھوڑوں گی۔“ وہ بولی۔ ”اس وقت تک نہیں جب تک

کہ تم وعدہ۔۔۔۔۔۔“

عین اسی وقت قادر شینڈور حجرے میں آگیا۔

”سزینٹ! آپ زیادہ نہ بولیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کو مکمل آرام کرنا

چاہئے۔ یہ بے حد ضروری ہے۔“

”قادر انہیں سمجھائیے۔ خدا کے لئے بتائیے انہیں کہ وہاں جانا پاگل پن ہے۔“

قادر شینڈور چارپائی کے قریب آکھڑا ہوا۔ اس نے مسکرا کر ڈانٹا کے ہاتھ پر اپنا

ہاتھ رکھ دیا۔

”سزینٹ! آپ کے شوہر نے یہ ٹھیک ہی کہا ہے۔ اس کے متعلق ہم کل

گفتگو کریں گے۔“

”اس نے چارلس کو چارپائی پر سے اٹھایا۔ اور ہاتھ پکڑ کر اسے حجرے سے باہر

لے آیا۔ ڈانٹا نے ان دونوں کو آوازیں دیں۔ لیکن وہ بڑھال ہو کر ڈھے گئی۔

باہر آکر قادر شینڈور نے دروازہ بند کر دیا اور کہا۔

کل صبح وہ ٹھیک ہو جائیں گی اور اس وقت ہم انہیں سمجھا سکیں گے کہ ہمیں کیا

کرنا ہے۔“

”وہ بڑی ضدی عورت ہے قادر۔“ چارلس نے کہا۔

اور یکایک اس کے دل میں اپنی بیوی کی محبت کی ایسی لہر اٹھی کہ اس کا جی چاہا کہ

دی تھی یا یہ آواز اس کے پریشان دماغ میں پیدا ہوئی تھی۔
پھر وہی آواز سنائی دی۔

شاید بلکہ یقیناً درختوں کی ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں کی تاب نہ لا کر دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ بارش کے قطرے کی بو چھاڑ خانقاہ کی نیچی چھت پر بج رہی تھی، باہر طوفان باد باراں زوروں پر تھا۔

اب تین دفعہ دستک دی گئی۔

آواز صاف اور واضح تھی۔ اب کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی یہ اس کا وہم نہ تھا۔ حقیقت میں کوئی دستک دے رہا تھا۔

ڈانٹا ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔

کھڑکی کے شیشے اندر سے دھندلا گئے تھے اور باہر دھندلا رہی تھی لیکن کھڑکی کے باہر اور اس کے شیشے سے چپکا ہوا چہرہ اسے صاف نظر آرہا تھا۔
ہیلن کا بگڑا ہوا، کمرناک اور ہلکی چہرہ۔

ڈانٹا کانپ گئی۔ وہ جہاں تھی وہیں بیٹھی رہی۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی جرات نہ کر سکی۔ وہ چیخا چاہتی تھی لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل رہی تھی۔

”رحم کرو۔“ ہیلن کے ہونٹ ہلے۔

ڈانٹا بت بن گئی۔

”رحم کرو“ ہیلن ایسی آواز میں التجا کر رہی تھی جو بمشکل سنی جاسکتی تھی۔

ڈانٹا نے اپنی ٹانگیں نیچے لٹکادیں۔ وہ بستر میں سے نکل آئی۔ لیکن جیسے ہی اس کے پیروں نے حجرے کی سنگین اور ٹھنڈے فرش کو چھوا کہ اس کے رگ و ریشے میں برقائی خوف سرایت کر گیا اور اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر حجرے سے نکل جائے اور

باب-۸

پناہ گاہ قید خانے میں تبدیل ہو گئی۔ دیواریں ایک دم سے جھک آئیں۔ وہ اسے پینے کے لئے آگے بڑھ رہی تھیں اور ڈانٹا اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کچھ جاگنے کے عمل میں تھی اور کچھ نیند میں تھی اور اسی عالم میں اس نے یوں محسوس کیا۔ جیسے وہ قعر ڈرکولا میں ہے کوئی اسے گھیر کر ایک کونے میں لے آیا ہے اور کوئی ایسی چیز جس کا چہرہ نہیں ہے اپنے بڑے بڑے بازو پھیلائے، اس کی طرف آ رہی ہے اس پر حملہ آور ہو رہی ہے۔ اس چیز کا چہرہ نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ اس چہرے کے ظالمانہ نقوش کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھی دو خونخوار بچے اس کی حلق کی طرف بڑھے اور دیوانہ وار اپنے دونوں ہاتھ چلا کر ان بچوں کو پیچھے ہٹانے لگی۔

لیکن یہ صرف خواب تھا۔ کبل کا صرف ایک کونہ اس کے ایک گال سے رگڑ کھا رہا تھا۔ اور جب اس نے ہاتھ چلائے تو کبل اس کی مٹھی میں تھا اس نے کبل اپنے اوپر سے گھسیٹ لیا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں اور ایک منٹ تک حجرے کی نیچی چھت کی طرف دیکھتی رہی وہ اپنے بے وجہ خوف پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ کیا حماقت تھی؟ حماقت تو نہیں البتہ عجیب بات ضرور تھی اس کا دل کیوں دھڑک رہا تھا حالانکہ اس خانقاہ میں وہ محفوظ تھی اور اس دوزخی ہستی کی دست سے باہر جس سے قعر ڈرکولا میں اس کا سابقہ پڑ چکا تھا۔

دستک کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

ڈانٹا بے حرکت پڑی رہی وہ یقین سے کہہ نہ سکی تھی کہ واقعی کسی نے دستک

گئی۔ چنٹی کل گئی تو وہ دست پکڑ کر کھڑی ایک پٹ کھولنے لگی۔ آہستہ آہستہ ہچکچاتے ہوئے

ہوا کا ایک تیز جھوٹا اندر کھس آیا۔ اس میں استرے کی سی کاٹ تھی اور کھڑی کھلتے ہی گاڑھی دھند کی دھندلک زدہ چیز کی طرح اچک کر اندر در آئی ہیلن کے ہونٹ اس کے دانتوں پر کھنچ گئے۔ وہ احساسِ فتح مندی سے ہوٹے ہوئے غراری تھی۔ دھند کے مرغلوں میں سے وہ ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے نکل آئے اور دوسرے ہی لمحے ڈانکا کی کلائی ایک آہنی گرفت میں تھی۔ یہ ہیلن تھی جس نے اس کی کلائی پکڑ لی تھی اور اس کی یہ پکڑ بڑی بیدردانہ تھی۔ ڈانکا نے اپنی کلائی اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اس نے چاہا کہ وہ پیچھے ہٹ کر اپنے حجرے کے انتہائی سرے پر پہنچ جائے۔ وہاں وہ محفوظ ہوگی۔ لیکن ہیلن نے اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اور اب اس کا سر تیزی سے جھکا اور اس کے دو تیز اور لالچے اور کیلے دانت ڈانکا کی کلائی میں گڑ گئے۔

ڈانکا درد و تکلیف اور خوف سے چیخ پڑی۔ فوراً ہی ہیلن نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر غائب ہو گئی لیکن دوسرے ہی لمحے کھڑکی کے چوکھٹے میں ایک اور چہرہ جڑا نظر آیا۔ لمبوتر، کھنچا ہوا، اور بھیانک چہرہ۔ کونٹ ڈر نکلا۔ اور اس نے اپنے دونوں پنجے پھیلائے اور سرخ دھاری دار اور سیاہ لبادے کے دونوں کونے پکڑ کر اسے یوں اٹھا رکھا تھا جیسے وہ ڈانکا کو اپنی دم گھونٹ دینے والی آغوش میں سمیٹ لے گا۔

ایکایک ڈانکا کی پشت کی طرف سے ایک دھاڑ کی آواز سنائی دی اور حجرے کا دروازہ کھل گیا ڈر نکلا تیزی سے پیچھے ہٹا اور دیکھتے اندھیرے میں غائب ہو گیا بالکل اسی طرح جس طرح شکاری پرندہ کوئی غیر متوقع آواز سے گھبرا کا اور اپنا شکار

چارلس کے پاس پہنچ جائے۔

لیکن وہ ایسا نہ کر سکی اس کے قدم فرش میں گڑے گئے۔ ہیلن کھڑکی کے شیشے پر اپنے پنجے چلا رہی تھی اور دیوانوں کی طرح جلدی جلدی اور عجیب عجیب منہ بنارہی تھی۔ ڈانکا نے اپنے آپ کو بدکنا چاہا لیکن روک نہ سکی جیسے وہ اپنی مرضی کی مالک نہ رہی تھی۔

ڈانکا کے قدم بے اختیار کھڑکی کی طرف اٹھ گئے۔

ہیلن کے چہرے کا رنگ حیرت انگیز حد تک سفید تھا جیسے اس کے بدن میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ رہا ہو اور اس کے بشرے سے عجیب طرح کا کرب اور بھوک عیاں تھی۔

ڈانکا کھڑکی کے قریب پہنچ چکی تھی چنانچہ اس کی آواز سن سکتی تھی۔

”ڈانکا! رحم کرو میرے حال پر۔ مجھے اندر آنے دو۔ باہر بہت زیادہ سردی ہے۔

میں ٹھہر رہی ہوں ڈانکا۔ رحم کرو مجھ پر“

ڈانکا شش و پنج میں پڑ گئی۔ اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا کاش کہ چارلس وہاں آجائے۔ کاش کہ فلور شینڈلر کہیں قریب ہی ہوتے اور پھر وہ فیصلہ کرتے کہ کھڑکیاں کھولی جائیں یا نہیں۔

”ڈانکا! میری اچھی بہن۔ میں درخواست کرتی ہوں۔“ ہیلن کا چہرہ انتہائی مایوسی کے عالم میں شیشے سے چپک گیا تھا۔ گھبراؤ نہیں ڈانکا۔ اب سب ٹھیک ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں وہاں سے بھاگ آئی ہوں رحم کرو ڈانکا۔ مجھے اندر آنے دو میں مختصر رہی ہوں اور پھر۔ پھر۔ اگر وہ۔ میرا تعاقب کرتا ہوا یہاں آگیا اور مجھے پکڑ کر لے گیا تو پھر کوئی مجھے اس کے پنجے سے چھڑانہ سکے گا۔“

ڈانکا نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور چنٹی نیچے سرکانے

چارلس نے ڈانکا کا ہاتھ پکڑ کر فادر شینڈور کی طرف لمبا کر دیا اور اسے اس طرح موڑ دیا کہ کلائی پر دونوں سوراخ اور ان میں سے قطرہ قطرہ نکلتا ہوا خون اوپر آگیا۔ فادر شینڈور نے اپنے بائیں ہاتھ سے ڈانکا کی انگلیاں ایسی مضبوطی سے پکڑ لیں کہ وہ انہیں ہلا بھی نہ سکتی تھی۔ اب اس نے وہ لیپ جسے وہ دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ ڈانکا کی کلائی پر جھکا دیا یہاں تک کہ اس پر چڑھا ہوا اور لپٹا ہوا شیشہ ڈانکا کی کلائی پر کے سوراخوں سے چھو گیا۔

درد و تکلیف کی آتشیں لہر اس کی کلائی سے اٹھی اور اس کے بازو میں سے گزرتی ہوئی پورے بدن میں دوڑ گئی۔ وہ سر سے پیر تک جیسے اندر ہی اندر جل اٹھی۔ وہ چیخ اٹھی اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن چارلس نے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا اور پھر فادر شینڈور جیسے طاقت ور آدمی کو جھک دینا ممکن بھی تو نہ تھا۔

یہ جلتا ہوا درد ختم ہونا چاہئے۔۔۔۔۔ اسے روک دینا چاہئے۔۔۔۔۔ وہ گیلی کلڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔۔۔۔۔ اس کا خون دیکتے ہوئے لاوے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی ہڈیاں پھٹک رہی تھیں۔ اس کا دماغ دھلکا ہوا انگارہ بن چکا تھا۔۔۔۔۔ اس کے دل کو اٹیشیسی پر بھونا جا رہا تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔۔۔۔۔ چنانچہ مسلسل چیخ رہی تھی۔

”خدا کے لئے فادر!“ چارلس بے قابو ہو کر چلایا۔ ”لیس اب بہت ہو گیا“

فادر شینڈور نے ڈانکا کی کلائی پر سے لیپ اٹھالیا۔ درد کی لہروں میں کمی واقع ہو گئی۔ لیکن جلے ہوئے گوشت پر ٹھنڈی ہوا کا اثر یہ ہوا کہ تکلیف کی شدت دہنی ہو گئی۔ ڈانکا کراہ کر پیچھے کی طرف ڈھے گئی۔ اس کی اعضا ڈھیلے پڑ گئے۔ تاہم اسے اتنا ہوش ضرور تھا کہ وہ یوں محسوس کر رہی تھی کہ کوئی اسے آہستہ سے اٹھا کر بستر پر لٹا رہا

چھوڑ کر پرواز کر جاتا ہے۔

ڈانکا پیچھے کی طرف جھونک کھا گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ گر رہی تھی لیکن فوراً ہی دونوں ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔

یہ چارلس تھا جو سارا دے کر اسے چارپائی کی طرف لئے جا رہا تھا۔

”کیا ہوا فادر شینڈور کی آواز سنائی دی۔“

”ڈانکا کو کچھ دھندلا سا احساس ہوا کہ فادر شینڈور حجرہ عبور کر کے کھڑکی کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی بند کر کے چٹخی لگادی، چارپائی کے قریب آیا اور ڈانکا پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ چارلس نے احتجاج کیا فادر شینڈور نے اسے ایک طرف ڈھکیل دیا۔ ڈانکا کے دونوں شانے پکڑ لئے اور بڑے غصے کے عالم میں اسے جھنجھوڑنے لگا۔“

”بتاؤ کیا ہوا؟“ بتاؤ“ اس نے کڑک کر پوچھا۔

ڈانکا نے بے بسی سے اپنے ہاتھ چارلس کی طرف پھیلا دیئے۔ موخر الذکر بے اختیار اس کی طرف بڑھا لیکن پھر فوراً ہی اس کے قدم رک گئے اور اس کا خون سرد ہو گیا۔

وہ پٹنی پٹنی آنکھوں سے ڈانکا کی اس کلائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس پر دو چھوٹے سے سوراخ تھے۔ فادر شینڈور نے بھی ڈانکا کے ہاتھ پر دونوں سوراخ دیکھ لئے۔

”خدا یا!“ وہ غرایا ”مسٹر چارلس! پکڑے رہو۔ انہیں۔“

فادر شینڈور نے ڈانکا کو چھوڑ دیا۔ وہ آزاد تھی۔ فوراً ہی چارلس نے آگے بڑھ کر اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال دیا۔ فادر شینڈور نے وہ لیپ اٹھالیا جو ایک کونے میں میز پر رکھا جل رہا تھا۔

”جی ہاں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ۔۔۔“

”ہم۔۔۔ ہمیں پہلے ہی سمجھ لیتا چاہئے تھا“ قادر شینڈور نے جلدی سے کہا۔ اور

چارلس کی طرف گھوم گیا ”آئیے میرے ساتھ۔“

چارلس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

”آپ ان کی فکر نہ کریں۔“ قادر شینڈور نے چارلس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا

تھا۔ ”برادر مارک ان کا کلائی پر پٹی کس دیں گے اور اسی حجرے میں رہیں گے۔“

ایک بار پھر ڈانکا اپنے ہاتھ بٹھا کر چارلس سے لپٹ جانا چاہتی تھی وہ چاہتی تھی

کہ اس کا شوہر اس کے قریب ہی رہے۔ لیکن وہ تو قادر شینڈور کے ساتھ جا رہا

تھا۔۔۔ اور وہ دونوں چلے گئے خاموش گزر گاہ میں سے ان کے پیروں کی چاپ کچھ

دیر تک سنائی دیتی رہی اور پھر دور ہو کر ڈوب گئی۔

ڈانکا نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی نگاہیں برادر مارک کی پر خلوص ہمدردی اور

ساتھ ہی ساتھ شکر لگاہوں سے کھرا گئیں۔

”میں بیٹھنا چاہتی ہوں“ مودہ آواز میں کہا۔

فورا ہی برادر مارک نے آگے بڑھ کر اپنی دونوں ہتھیلیاں اس کے شانوں کے

پچھے لٹکائیں اور اس طرح سارا دبے کر اسے آہستہ سے اٹھا کر بٹھا دیا۔ ”اس طرح

بٹی کس نے میں بھی آسانی ہوگی۔“ برادر مارک پٹی کس چکا تو اس کے بعد بھی وہ بیٹھی

رہی۔ وہ لیٹنا نہ چاہتی تھی، وہ سونا نہ چاہتی تھی۔۔۔ وہ جاگنا اور بیٹھے رہنا چاہتی تھی

کہ خواب پریشاں کی وہ بھیاں صورت اسے پھر نظر نہ آئے وہ۔۔۔ وہ عفریت کھڑکی

میں پھر نمودار نہ ہو۔

ڈانکا خاموش تھی تاہم برادر مارک سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ چنانچہ وہ حجرے کے

استائی سرے پر رکھی ہوئی ایک کرسی میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ گود میں

تھا اور پھر وہ قادر شینڈور کی آواز بھی سن رہی تھی جو بہت دور سے آتی ہوئی معلوم

ہوتی تھی۔ کہیں گمراہیوں میں سے آ رہی تھی۔

”برادر مارک! مریم لگا کر پٹی کس دو“ قادر شینڈور کہہ رہا تھا۔

اور چارلس قریب ہی تھا۔ بہت قریب۔ وہ شاید اس پر جھکا سرگوشی میں کچھ کہہ

رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنی باہیں چارلس کی گردن میں ڈال دے لیکن وہ ایسی محسن

محسوس کر رہی تھی کہ انگلی تک نہ ہلا سکتی تھی اور پھر اس خیال سے خوف زدہ بھی تھی

کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا ذرا سی حرکت اس دوزخی تکلیف کی لہروں کو اس کے جسم

میں ایک بار پھر دوڑا دے۔

”شکر ہے کہ ہم عین وقت پر پہنچ گئے۔“ قادر شینڈور نے کہا۔

قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ ڈانکا نے اپنی کلائی پر ٹھنڈک سی محسوس کی۔

کوئی ٹھنڈی چیز اس کی کلائی پر چڑی جا رہی تھی۔ کچھ لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ

ٹھنڈی چیز اس کی کلائی پر سرد آگ کی طرح سنگ اشلی چند سیکنڈ تک یہ سرد آگ

نا قابل برداشت رہی اور پھر اس نے درد کی ٹیسوں کو ماند کر دیا۔ برف آگ سے دست

و گرہاں تھی۔ ڈانکا نے کچھ اور سوچنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی جسم کے دوسرے اعضاء

کی طرف متوجہ ہونا چاہتی تھی لیکن اس بازو میں دھڑکتا ہوا درد اسے کسی اور طرف

متوجہ نہ ہونے دیتا تھا اور دوسرے تمام احساسات پر غالب تھا۔

”خانقاہ میں مسافر تو مقیم نہیں ہیں؟“ قادر شینڈور پوچھ رہا تھا۔

”خانقاہ میں کوئی مقیم نہیں ہے“ قادر ”برادر مارک نے جواب دیا۔ خود آپ ہی کا

حکم تھا کہ کسی کو بھی خانقاہ میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ لیکن ایک چمکڑے والا چہاں

آیا تھا۔ وہ خانقاہ سے باہر مقیم ہے۔ اس کے لئے کھانا بھیج دیا گیا ہے۔“

”چمکڑے والا!“ قادر شینڈور چونکا۔

رکھے کسی خیال میں غرق تھا۔ ڈانٹا جانتی تھی کہ اگر اس نے بولنا چاہا تو برادر مارک فوراً اس سے مصروف گفتگو ہو جائے گا اور اسے تسلی دے گا۔ لیکن اس وقت وہ کچھ کہنا نہ چاہتی تھی۔ وہ سکون اور خاموشی چاہتی تھی اور..... برادر مارک بھی خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

دروازے پر کسی نے ناخن گھسے اور ”خرر... خرر“ کی ایک ہلکی سی آواز نے خاموشی کے اس سحر کو توڑ دیا۔ برادر مارک چشم زدن میں کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔



ایک اجازت صورت اور وحشت ناک آنکھوں والا شخص دروازے میں کھڑا ہوا۔ وہ کچھ کھڑا تھا اور کچھ سستا ہوا تھا یوں سمجھئے کہ وہ اس کتے کی طرح دھکا ہوا تھا جس کی پیٹھ پر پڑنے کے لئے آقا کا ڈنڈا بلند ہو چکا ہو۔ لیکن ڈانٹا کو وہ اس بھیڑیے کی طرح معلوم ہوا جو شکار پر یاد دشمن پر جھپٹنے کے لئے اپنا بدن گھسیٹ چکا ہو۔

”لڈوک! تم“ برادر مارک کے لہجے سے حیرت ظاہر تھی ”تم اپنے حجرے سے باہر دریاں کیا کر رہے ہو؟“

”میرے حجرے کو ایک اہم کام کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔“ لڈوک نے جواب دیا۔

”اور پھر اس نے برادر مارک کے کندھوں پر سے اپنی نظر گزار کر ڈانٹا کی طرف دیکھا۔ لڈوک کی آنکھوں سے بے پروائی اور عیاری کے طے جلتے جذبات جھانک رہے تھے۔“

”مادام!“ وہ بولا ”فادر شیشور نے آپ کو سلام کہا ہے اور اپنی مطالعہ گاہ میں آپ کو طلب کیا ہے۔ تشریف لائیے۔“

”لیکن مجھے ہدایت کر دی گئی ہے کہ..... برادر مارک نے احتجاج کرتے ہوئے

کنا شروع کیا۔

لڈوگ نے کسی بادشاہ کی طرح بڑی شان سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا دیا ڈانکا اس شخص کے درجے اور مقام سے واقف نہ تھی اور نہ جانتی تھی کہ یہ شخص جس کا نام لڈوگ تھا، خانقاہ میں کیا تھا البتہ اتنی بات تو وہ بھی دیکھ سکتی تھی کہ اس نے برادر مارک کو گزیرا دیا تھا اس کے علاوہ اس کی ایک ایک حرکت سے حکیمانہ شان عیاں تھی۔ چنانچہ ظاہر ہوا کہ اس شخص کو خانقاہ میں کوئی بلند مقام حاصل تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر ہاتھ بڑھا کر کھوٹی پر سے اپنا چہرہ کھینٹ لیا اور لڈوگ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

”برادر! حالات پر قابو حاصل کر لیا گیا ہے“ لڈوگ نے کہا۔ چنانچہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اور اس سے پہلے کہ برادر مارک کچھ کہہ سکتا یا سننے سے بحث کا آغاز کر سکتا لڈوگ ڈانکا کو دھکیل کر نہ صرف گزر گاہ میں لے آیا تھا بلکہ اسے آگے لے جا رہا تھا۔ گزر گاہ میں آتے ہی ڈانکا کو پھیری آگئی اور اس کا جی چاہا کہ وہ لوٹ جائے لیکن لڈوگ یوں تیز حیز قدم اٹھا رہا تھا جیسے وہ ڈانکا کو وہاں پہنچا کر جہاں اسے پہنچانے کا حکم ملا تھا۔ اس فرض سے جلا از جلد سبکدوش ہو جانا چاہتا ہو۔ اور ڈانکا سوچ رہی تھی کہ خدا جانے کیا ہوا تھا اور اس کے شوہر اور غور شیئندہ کو خدا جانے کون سی نئی بات معلوم ہوئی تھی کہ انہوں نے اسے بلا بھیجا تھا۔

آگے آگے چلتا ہوا لڈوگ ایک دروازے کے قریب آکر رک گیا۔ گردن تھما کر پیچھے آتی ہوئی ڈانکا کی طرف ایک نظر دیکھا۔ دروازے پر دستک دی اور جواب کا انتظار کئے بغیر اسے کھول کر ایک طرف ہٹ گیا کہ ڈانکا اندر داخل ہو جائے۔ ڈانکا حجرے میں داخل ہو گئی۔

بے شک یہ قادر شیئندہ کی مطالعہ گاہ ہی تھی۔ کتابوں کی الماریاں کمرے کی دیواروں کے نیچے پن کو ڈھانپ رہی تھیں، سامنے میز بھی تھی۔ پالش کی ہوئی، صاف اور چمکدار اور یہ چیزیں اس کمرے کو خود اس کے حجرے سے زیادہ قابل قبول بنارہی تھیں۔

لیکن اس کمرے میں قادر شیئندہ نہ تھا۔ کوئی نہ تھا۔

اس نے اپنی پشت کی طرف سے دروازہ بند ہونے اور پھر قفل لگنے کی ہلکی سی آواز سنی۔ وہ ایک دم سے دروازے کی طرف گھوم گئی۔

لڈوگ غائب تھا۔ وہ اس کے ساتھ کمرے میں نہ آیا تھا۔ لیکن بند دروازے سے ٹپک لگائے کوئی اور کھڑا بھوکی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہی۔ وہی۔۔۔ کونٹ ڈریکولا۔

شدید خوف اس کے دل کی گہرائیوں میں سے اٹھا اور اس کے بڑے بڑے بلبلے اس کے حلق میں آکر پھنس گئے، اس سے پہلے کہ وہ چیخ کر ان بلبلوں کو پھوڑ دیتی، ڈریکولا نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا دیا اور اپنے خوفناک پنجہ سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ڈریکولا کی آنکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے ان کے پیچھے دوزخ کے شعلے سلگ رہے ہوں۔

ڈانکا کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ ان جلتی ہوئی بجلیاں آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی کہ کسی دم میں وہ گر پڑے گی۔ آنکھوں کے جلتے ہوئے ان دوزخی گڑھے میں جا پڑے گی۔ ڈریکولا کی شیطانی آنکھوں کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ آگے۔ آگے۔ آگے۔۔۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہی وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلی تھی اس کے باوجود یہ عجیب بات تھی کہ وہ ڈریکولا کی طرف کھینچ رہی تھی۔ یا یہ شاید اس کی روح تھی جو کھینچ رہی تھی وہ اسی جگہ کھڑی ہوئی

کارنگ زردی مائل سفید تھا۔

ڈریکولانے اپنے ایک ہاتھ کی جھنگلیا کے لائے اور تیز ناخن سے اپنے ننگے سینے پر اوپر سے نیچے تک ایک لکیر کھینچ دی اور پھر ایک جگہ جہاں انسان کا دل ہوتا ہے۔ جھنگلیا کا یہ تیز اور لانا ناخن جڑ تک ڈریکولا کے سینہ میں اتر گیا۔

اس سوراخ میں سے خون نکل آیا۔

ڈریکولانے دوسرا ہاتھ بڑھا کر ڈانٹا کا ایک ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچا ڈانٹا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد نہ کی وہ بڑی فراہم داری سے کبھی چلی آئی ڈریکولانے اس کا ہاتھ چھوڑ کر ڈانٹا کی گردن پکڑ لی اور اب وہ اس کے سر کو آہستہ آہستہ نیچے جھکا رہا تھا۔ اپنے سینہ پر اور اپنے سینے پر کے اس سوراخ پر جس سے خون رس رہا تھا۔

ڈانٹا کا سر اس کے سینہ پر جھک گیا۔ اس نے ڈریکولا کا خون دیکھا تقریباً سیاہ اور دھنسا ڈانٹا کی پیاس بھڑک اٹھی وہ اس خون کا مزہ چکھنے کے لئے پیاب ہو گئی۔ لیکن وہ سحر ٹوٹ چکا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ چنانچہ ڈریکولا کی جلتی ہوئی آنکھوں کے اثر سے وہ آزاد ہو چکی تھی، وہ چونکی اسے ہوش سا آگیا اور اب وہ ڈریکولا کی بے دروانہ گرفت سے آزاد ہونے کے لئے دیوانہ وار جدوجہد کر رہی تھی۔ ڈریکولا اس درد سے کی طرح غرایا جو دوپچے ہوئے اپنے شکار کو چھوڑنے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہو اس نے جلدی سے ڈانٹا کی گردن چھوڑ کر اس کے بال پکڑ لئے اور اس کے سر کو جبرا اپنے سینے پر اور اس خون کے رستے ہوئے سوراخ پر جھکانے لگا۔

ڈانٹا بے تحاشہ ہاتھ چلا رہی تھی وہ ڈریکولا کے سینے پر گھونے چلا رہی تھی۔ اور کوشش کر کے وہ آخر کار اپنا سر ڈریکولا کے سینے پر سے اتار اٹھانے میں کامیاب ہو گئی کہ چیخ سکے اور ڈانٹا کی ٹلک شکاف چیخ مطالعہ گاہ میں گونج گئی۔ اور اس چیخ کا جواب

تھی اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو ڈریکولا کی آغوش میں محسوس کر رہی تھی۔ دووں دور دور کھڑے ہوئے تھے۔ تاہم وہ اس غریبیت کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ زیادہ سے زیادہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔

ڈریکولا مسکرایا۔ اس کا اوپری ہونٹ غیر قدرتی انداز میں اوپر چڑھ گیا وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ ڈانٹا کی طرف اور اسے ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے اس کے باوجود وہ ڈریکولا کی آرزو کر رہی تھی وہ خوفزدہ تھی لیکن ڈریکولا کے سینے سے لگ جانا چاہتی تھی۔

ڈریکولانے اپنا پتلا ہاتھ اٹھایا۔ وہ ڈانٹا کے حلق کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

ڈانٹا نے ڈریکولا کا یہ حکمانہ اشارہ کچھ دیکھا اور کچھ نہ دیکھا کیونکہ اس کی نظر کو ان دو جلتی ہوئی آنکھوں نے اب بھی جکڑ رکھا تھا وہ اب بھی دونوں کے اس کھنڈوں میں محسوس جھانک رہی تھی ایک بار پھر ڈریکولانے اپنا ہاتھ اٹھا کر اور ڈانٹا کی نظروں کے سامنے ہلا کر اس کے حلق کی طرف اشارہ کیا۔ اور اس دفعہ وہ سمجھ گئی، ڈانٹا کا ہاتھ اپنے آپ یعنی ڈانٹا کی مرضی سے نہیں۔ آہستہ آہستہ اوپر اٹھا۔ خود اس کے حلق کی طرف، اس نے گریبان پکڑ لیا۔ اس نے ایک معمولی سا جھکا دیا اور گریبان ”چرر“ سے پھٹ گیا ڈانٹا کا حلق اب کھلا تھا۔ اس کا ہاتھ حلق پر بیٹھنے لگا اور اس کی انگلیوں نے اس ڈوری کو گرفت میں لے لیا۔ جو اس کی، ڈانٹا کی، گردن میں پڑی ہوئی تھی۔ اس ڈوری سے ایک چھوٹی سی سنہری صلیب نکل رہی تھی ڈانٹا کے ہاتھ نے گردن میں سے ڈوری کی گرہ کھول دی اور پھر اس نے وہ ڈوری مع سنہری صلیب کے ایک طرف پھینک دی۔

ڈریکولا مسکرایا۔

اپنی نظر کے سر سے ڈانٹا کو آزاد کئے بغیر ڈریکولانے اپنا گریبان ایک ہاتھ سے پکڑ کر نیچے تک پھاڑ دیا اور اب اس کا سینہ عریان تھا پسلیوں پر منڈھی ہوئی جھلی کی سی جلد

پاسکے گا۔ عمر بھر ملکوں ملکوں کی خاک چھاننے کے باوجود اسے تلاش نہ کر سکے گا اور کبھی بھی تلاش نہ کر سکے گا۔

”چارلس!“ اس کا دل پکار اٹھا۔

لیکن چارلس وہاں نہ تھا اور وہ ڈریکولا تھا جس نے اسے اٹھا رکھا تھا اور وہ اندھیری رات میں تیزی سے بھاگ رہا تھا اتنی تیزی سے کہ معلوم ہوتا تھا کہ پرواز کر رہا ہو اور یہ غفرت ڈانکا کو اس دونخ کی طرف لئے جا رہا تھا۔ جس کا نام ”زندہ مردوں کی دونخ“ ہے جو بھیانک اور خون چوسنے والے ویپرائوں کی دنیا ہے۔



ڈریکولا کی ایک اور غراہٹ نے دیا۔

”ڈانکا۔ آ۔ آ۔“

ایک آواز، ایک پکار مطالعہ گاہ کے کواڑوں کی جھریوں میں سے اندر گھس آئی چارلس کی آواز، بیشک یہ چارلس کی آواز تھی لیکن بہت دور سے آئی تھی گزر گاہ کے انتہائی سرے پر۔

ڈانکا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوششیں تیز کر دیں آخر وہ اپنے آپ کو چھڑا کر دروازے تک بھاگ سکتی۔ اگر وہ کچھ دیر کے لئے اپنا منہ اس گھٹاؤ نے خون رستے زخم سے دور رکھ سکتی، اگر وہ چند منٹ کے لئے ڈریکولا۔۔۔“

کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کا چھٹکا سنائی دیا۔ ڈریکولا نے اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی۔ اس نے ڈانکا کے بال نہ چھوڑے، بلکہ وہ اسے لئے لئے کھڑکی طرف گھوم گیا۔

کھڑکی کے فریم میں لڈوگ کا چہرہ جڑا ہوا تھا۔ وہ ڈریکولا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے اشارے سے ڈریکولا کو اس طرف آنے کو کہا اور پھر اپنی کنہی سے بقیہ شیشہ بھی توڑ دیا۔

ڈریکولا کا ایک زور دار گھونہ ڈانکا کے سر پر پڑا، اس کا بھیجا مل گیا۔ بند ہوئی ہوئی آنکھوں کے سامنے تارے سے ٹاچ گئے اور پھر ان نے محسوس کیا کہ ڈریکولا اسے اپنی باہوں میں اٹھا رہا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگا اور اپنے ہاتھوں پر ڈانکا کو سنبھال کر اس نے کھڑکی کی طرف چھلانگ لگادی۔ جتنا کچھ شیشہ ٹوٹنے سے بچ رہا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔

ڈریکولا، ڈانکا سمیت باہر نکل چکا تھا۔

ایک بار پھر وہی بھیانک خواب پریشان ڈانکا پر قبضہ جما چکا تھا چارلس اسے چھوڑ چکا تھا۔ بھول چکا تھا یا شاید اس تک پہنچنے میں ناکام رہا تھا اور اب وہ ڈانکا کو کبھی نہ

باب-9

بستر بچھا ہوا تھا۔ فادر شینڈور نے دوسری صلیب اس تابوت میں رکھ دی۔
 ”چھکڑے والا“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”شاید وہی وفادار کلیو ہوگا بشرطیکہ ہم اس کی
 غلامی کو وفاداری کہہ سکیں وہ ان دونوں کو دیپانوں کو۔۔۔۔۔“
 ”دونوں دیپانوں کو!“

”ہاں۔ کیونکہ تابوت دو ہیں۔ چنانچہ ایک ڈریکولا کا اور دوسرا۔“

”دوسرا؟“ چارلس نے پوچھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ دوسرا دیپان کون ہے۔

”آپ کی بھالی۔ چنانچہ دن کی روشنی میں جب یہ دونوں دیپان اپنے اپنے تابوت
 میں سو رہی تھیں، کلیو ان تابوتوں کو چھکڑے میں رکھ کر یہاں لے آیا کہ جب رات کا
 اندھیرا اتر آئے تو یہ دونوں عفریت اپنے اپنے تابوت میں سے نکل کر اپنا اپنا شکار
 حاصل کر لیں۔ لیکن اب۔۔۔۔۔“ اس نے تابوتوں کی طرف اشارہ کیا۔
 ”اب کیا؟“ چارلس نے سانس روک کر پوچھا۔

”اب یہ کہ چونکہ ہم نے دونوں تابوتوں میں ایک ایک صلیب رکھ دی ہے اس
 لئے رات کے ختم ہونے کے وقت دیپان ان تابوتوں میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ اب
 اگر ہم انہیں پکڑ نہ سکے اور فرار ہوتے رہیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ رات ختم ہو جائے گی
 اور دونوں دیپان سورج کے رحم و کرم پر ہوں گے اور جب سورج کی شعاعیں براہ
 راست دیپان پر پڑتی ہیں تو فنا ہو جاتا ہے۔“

”مطلب یہ کہ ہمیں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہئے۔“ چارلس نے کہا

”ہاں۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔“ فادر شینڈور نے کہا، ”کاش کہ میں نے تمہارا یہ
 مشورہ مان لیا ہوتا کہ ہمیں فوراً قصر کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے۔ جب برائی کا پودا
 پھوٹ نکلے تو اسی وقت اسے اکھاڑ پھینکنا چاہئے کہ وہ بڑھ کر تناور درخت نہ بن
 جائے۔ اور جب شیطان آزاد ہو چکا ہو تو بلاناخیر اس کی بجائی کر دینی چاہئے۔“

فادر شینڈور چارلس کو ڈانٹا کے کمرے سے باہر لے آیا۔ اور باہر آتے ہی سیدھا
 خانقاہ کے صدر دروازہ کی طرف چلا اور چارلس اس کے ساتھ تھا فادر شینڈور جلدی
 میں ضرور تھا لیکن وہ جو کچھ کر رہا تھا وہ بے سوچے سمجھے نہ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ
 معلوم ہو رہا ہے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہاں اسے کیا ملے گا۔

دروازہ کھول کر اس نے باہر دیکھا درختوں کے ایک جھنڈ میں چھکڑا کھڑا تھا۔ فادر
 شینڈور کو جب یقین ہو گیا کہ چھکڑے کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ اس نے دروازہ کھول
 کر باہر آگیا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا چھکڑے کے قریب پہنچا اور بے دھڑک اس پر جا چڑھا
 اور اپنے مضبوط ہاتھ سے چارلس کا ہاتھ پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں اسے بھی اوپر گھسیٹ
 لیا۔

چھکڑے میں دو لمبے بکس رکھے ہوئے تھے۔ بکس یا۔۔۔۔۔ تابوت فادر شینڈور نے
 ایک تابوت کا ڈمکن اٹھایا، تابوت خالی تھا البتہ اس میں باریک مٹی کی چکنی سی تہ
 بھی ہوئی تھی جیسے کسی کا بستر لگا ہوا ہو۔

”ہم“ وہ بڑبڑایا۔ ”مجھے پہلے ہی سے سوچ لینا چاہئے تھا۔“

”کیا سوچ لینا چاہئے تھا؟“ چارلس نے پوچھا۔ وہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔

”یہی کہ وہ اسی طرح یہاں آئے گا اور ضرور آئے گا۔“ فادر شینڈور نے کہا۔

اور اپنے چننے کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر دو صلیبیں برآمد کیں ایک صلیب اس
 نے اس تابوت میں جس کا ڈمکن اس نے اٹھایا تھا، مٹی پر رکھ دی۔ اور سر سے
 چارلس کو اشارہ کیا کہ وہ دوسرے تابوت کا ڈمکن کھول دے، چارلس نے ڈمکن
 کھولا۔ خانقاہ کی کھڑکی سے آتی ہوئی اندھی روشنی میں اس نے دیکھا کہ باریک مٹی کا

وہ کمرے سے نکل گیا تو دو راہب حجرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک

چیز نہیں ہے۔“

عورت کو اپنے درمیان پکڑ رکھا تھا جو کسی وحشی جانور کی طرح اپنی کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔

چارلس لٹوگ کو بھول گیا۔ وہ ہر چیز اور ہر بات کو بھول گیا۔ وہ صرف ہیلن کو دیکھ رہا تھا اور صرف اس کی آواز سن رہا تھا۔ ہیلن کے شیطانی وجود سے حجرے کی فضا متعفن ہو گئی۔ اس کا دوزخی سانس فضا کی رگ رگ میں سا گیا۔ اور چارلس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس حجرے کا مقدس ماحول یکثرت بدل گیا ہو۔ اس کی طبیعت گھبرانے لگی اور اسی کا جی چاہا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے۔

چارلس ہیلن کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس نفرت انگیز اور گھناؤنی صورت میں عورت کے خد و خال تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو تند و خشک مزاج اور چڑچڑی ہونے کے باوجود اس کی مخلص اور محبت کرنے والی بھابی تھی۔ لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ یہ عورت اس کی بھابی نہ ہو سکتی تھی اس کے ہونٹ کھینچے ہوئے تھے اس کے خونخوار دانت چمک رہے تھے اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔

فادر شینڈور اس کی طرف بڑھا تو وہ جنسی بھوت کی طرح اپنے آپ کو چھڑانے اور فادر شینڈور پر حملہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ چارلس بھی آگے بڑھ کر فادر شینڈور کے قریب جا کھڑا ہوا کہ جب ضرورت ہو تو وہ اس کی مدد کرے چارلس کو دیکھتے ہی وہ غرائی اور پھر اس نے ایک ققمہ لگایا۔ اس کا یہ ققمہ چیخ سے مشابہ تھا اور اتنا بھیانک تھا کہ چارلس کی ریزہ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی لہر دوڑ گئی۔

اگر وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو کاٹنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر وہ اس کا ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اسی کا یا ڈرا کیولا کا۔ چارلس نے اس کے خونخوار اور زہریلے دانتوں پر سے اپنی نظریں ہٹانے کی کوشش کی لیکن ہٹانہ سکا۔

فادر شینڈور نے گردن گھما کر چارلس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”مسٹر چارلس! اس بلا کو دیکھئے اور یاد رکھئے کہ یہ وہ عورت نہیں ہے جس سے آپ واقف تھے۔ یہ وہ نہیں ہے جو آپ کی بھابی تھی۔ آپ کے بھائی کی بیوی مر چکی۔ یہ جو آپ کے سامنے ہے یہ ایک خول ہے اور اس خول میں جو ہے وہ ایک غیبی روح ہے جس کی غذا انسانوں کا خون ہے چنانچہ ہم جس چیز کو فنا کریں گے وہ یہ غیبی روح ہوگی جو اس خول میں ڈرا کیولا کی مہربانی سے ساگئی ہے۔“

چارلس خاموش رہا۔ وہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔

”لے آؤ اسے“ فادر شینڈور نے کہا۔

اور دونوں راہب جو اسے پکڑے ہوئے تھے۔ ہیلن کو گھسیٹ کر کراس میز کی طرف لانے لگے جس کے سامنے بیٹھ کر لٹوگ بڑی تندہی اور توجہ سے دست کاری کے نمونے بنایا کرتا تھا۔ فادر شینڈور نے وہ دو چار برش اور کاغذ کے ٹکڑے میز پر سے ہٹا دیئے جو اب بھی اس پر پڑے ہوئے تھے۔

ہیلن دیوانوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ بھیڑیے کی طرح غراری تھی اور کتے کی طرح رو رہی تھی۔ اس کا پورا جسم کبھی تن جاتا تھا اور کبھی ڈھیلا پڑ جاتا تھا۔ وہ نافق الفطرت قوت سے لاتین چلا رہی تھی، تڑپ رہی تھی اور مروٹیاں لے رہی تھی لیکن دونوں راہبوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

راہب اسے گھسیٹ کر میز کے قریب لے آئے اور بڑی کوششوں کے بعد اس پر چت لٹا دیا اور اسے دبوچے رہے۔ اب ایک تیسرا راہب حجرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نوکدار چوبی کھونٹ تھا جو ایک فٹ لمبا تھا۔ کھونٹ کی لکڑی حجرے کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اور اس تازہ لکڑی کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ یہ کھونٹا ابھی تیار کیا گیا تھا۔ راہب نے یہ کھونٹا فادر شینڈور کو دے دیا اور پھر اپنے ڈھیلے ڈھالے چننے میں ہاتھ ڈال کر ایک وزنی موگری برآمد کی۔

پھر ساکت ہو گیا۔

چارلس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”مسٹر چارلس!“ فادر شینڈور نے بڑی نرم آواز میں کہا۔ ”یہ مرحلہ طے ہو گیا۔“
اس نے چند قدم پیچھے ہٹ کر چارلس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے میز کے قریب لے آیا۔ چارلس دیکھتا نہ چاہتا تھا لیکن خود بخود اس کا نگاہیں میز پر جھک گئیں۔

اور اس نے دیکھا کہ اب میز پر وہ ڈائمن نہیں بلکہ اس کی بھابھی ہیلن لیٹی ہوئی تھی۔ وہی نقوش اور وہی خد و خال۔ اس کے بشرے سے اب وہ گھٹا واپس عیاں نہ تھا۔ اب یہ کسی دوزخی بلا کا نہیں بلکہ اس کی بھائی کی اصل بیوی کا چہرہ تھا۔ اب اس پر کڑھکی کے بجائے ملاحظہ تھی اور خون کی پیاس کے بجائے ٹکوتی سکون تھا۔ ہیلن پر سکون اور ابدی نیند سوری تھی۔



فادر شینڈور میز کی طرف گھوم گیا۔

ہیلن جسے میز پر چپ لٹایا گیا تھا۔ ایک راہب نے اسے شانوں کے قریب سے اور دوسرے نے اس کی ٹانگیں ایسی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھیں کہ وہ اپنے سر کے علاوہ کوئی اور عضو ہلا نہ سکتی تھی۔ اور وہ اپنا سر بیچ رہی تھی اسے دائیں بائیں تیزی سے ہلا رہی تھی۔ وہ تھوک رہی تھی، چیخ رہی تھی اور غرا رہی تھی۔ یہاں تک کہ جہر اس کی ان غیر ارادی آوازوں سے گونجنے لگا۔

فادر شینڈور ہیلن کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے لمحے بھر کے لئے اپنی نگاہیں حجرے کی چھت کی طرف اٹھا دیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کوئی دعا پڑھ رہا تھا۔

اور پھر اس نے وہ چوٹی کھوٹا ہیلن کی بائیں چھاتی پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے موگری بلند کی۔

چارلس نے اپنے معدے میں شدید اینٹھن محسوس کی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام کر دوہرا ہو جائے اور قے کر دے کہ یہ تکلیف کم ہو۔ اسے یہاں نہ آنا چاہئے تھا۔ وہ یہ کارروائی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کوئی انسان نہ دیکھ سکتا تھا۔

لیکن وہ ہیلن اور فادر شینڈور پر سے اپنی نظریں ہٹا نہ سکا۔

دفعۃً فادر شینڈور کا موگری والا ہاتھ بجلی کی تیزی سے نیچے چلا۔ اور ایک خون منجمد کر دینے والی چیخ سے حجرے کی سنگین دیواریں کانپ گئیں۔ یہ ہیلن کی اور کسی بھی انسان کی چیخ نہ تھی۔ یہ عذاب میں پھنسی ہوئی ایک روح کی آخری چیخ تھی۔ موگری کی ایک ہی ضرب میں چوٹی کھوٹا نصف سی زیادہ ہیلن کے سینے میں اتر چکا تھا۔ اس کا ’کھونٹے کا‘ اوپری حصہ جو اس کے سینے سے باہر تھا لمحہ بھر تک تھر تھراتا رہا اور

اس وقت فادر شینڈور کے ہاتھ میں تھا۔

”لڈوگ!“ فادر شینڈور بڑبڑایا ”ہم نے اس کے لئے کیا کچھ نہیں کیا اس کے باوجود اب وہ فرار ہونا چاہتا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟“
وہ کھڑکی کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے رات کے اندھیرے کے اسرار معلوم کرنا چاہتا ہو۔

”کیس ایسا تو نہیں کہ۔۔۔ اس کا وہ دوزخی آقا ڈرا کیوالا اسے بلا رہا ہو؟ لڈوگ۔۔۔ اس کے پاس تو بچنے کی کوشش نہیں کر رہا؟“
اور دفعتاً ”فادر شینڈور تن کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بار پھر وہ عملی قدم اٹھانے کے لئے تیار تھا۔

”آئیے مسٹر چارلس۔ اگر لڈوگ کے دل میں یہ آرزو اور یہ طلب بیدار ہو چکی ہے تو ہم اسے آزاد نہیں چھوڑ سکتے۔“

اور وہ گزرگاہ میں چل پڑا۔ فادر شینڈور ایسے لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا اور اتنا تیز چل رہا تھا کہ اس کا ساتھ دینے کے لئے چارلس کو تقریباً بھاگنا پڑا رہا تھا۔ گزرگاہ کے ایک اندھیرے کونے میں وہ دونوں کسی چیز سے ٹکرا گئے۔ جو فرش پر پڑی ہوئی تھی دونوں گرتے گرتے بچے تو وہ چیز کراہنے لگی۔ یہ برادر مارک تھا جو بے سدھ اور گٹھری بنا پڑا تھا۔ فادر شینڈور جلدی سے اس پر جھک گیا اور برادر مارک کا سر ٹٹولنے لگا۔ اس کے سر پر کسی ٹھوس دھننی چیز سے ضرب لگائی گئی تھی۔

”لڈوگ!“ فادر شینڈور بڑبڑایا ”کہاں۔۔۔ ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔

یہ ڈانٹا کی چیخ تھی اور چارلس نے اس کی آواز پہچانی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرف بڑی بیوی کے حجرے کی طرف بھاگا۔ فادر شینڈور بھی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر برادر ارگلو اس کے حال پر چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگ پڑا۔

حجرے میں موجود راہب رب العزت کی حمد گانے لگے اور چارلس اور فادر شینڈور سر جھکائے کھڑے رہے۔ اور خاموشی سے ہیلن کی مغفرت کی دعا مانگتے رہے۔

”آئیے مسٹر چارلس“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”اس وقت آپ کو شراب کی ضرورت ہے۔“

اور جب وہ دروازے کی طرف چلے تو اس سے چند قدم ادھر فادر شینڈور نے کسی آہنی چیز سے ٹھوکر کھائی اور وہ چیز ایک چھتا کے کی آواز کے ساتھ فرش پر چند انچ تک لڑھکتی چلی گئی۔ فادر شینڈور نے جھک کر وہ چیز اٹھالی۔ یہ ایک آہنی سلاخ تھی۔ فادر شینڈور نمایاں طور پر چونکا۔ چارلس حیران تھا کہ اس میں چونکنے کی کیا بات تھی! فادر شینڈور حجرے کی کھڑکی کی طرف گھوم گیا۔ کھڑکی میں چار سلاخیں ہوا کرتی تھیں۔ دو سلاخیں بڑی مہارت سے کاٹ دی گئی تھیں۔ اور ان کئی ہوئی سلاخوں کا ایک ٹکڑا

برھے اور بڑی خطرناک تیزی سے چھکڑے کو غیر ہموار راستے پر سے کھینچنے سڑک کی طرف چلے۔

”گھوڑے۔“ چارلس چیخا۔ ”گھوڑے لاؤ۔ جلدی۔“
”فکر نہ کرو۔ ہم ان کا تعاقب کریں گے۔“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”لیکن غلط اور بدحواسی میں نہیں۔“

اور وہ واپس خانقاہ کی طرف چلا۔ لڈوگ زمین پر پڑا۔ لوٹ رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ فادر شینڈور نے شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن پھر فوراً ہی اس کا غصہ رحم اور ہمدردی میں تبدیل ہو گیا۔ لڈوگ غریب کا کیا قصور تھا؟ ڈرائیولا مافوق الفطرت قوتوں کا مالک تھا اور بے گناہ انسانوں پر اثر ڈال کر انہیں اپنا غلام بنا لیتا تھا وہ تو شکر ہے کہ ڈرائیولا ابھی ابھی زندہ ہوا تھا۔ صرف ہیملن کا خون پی سکا تھا۔ چنانچہ اس کی تمام قوتیں عود کر آئیں تو وہ یوں بزدلوں کی طرح فرار ہونے کے بجائے اپنے ہاتھ کے ایک اشارے سے بھیڑیوں کی پوری فوج بلا لیتا۔ اور یہ بھیڑیے چارلس اور فادر شینڈور کی بوٹیاں اڑا دیتے لیکن کونٹ ڈرائیولا زندہ ہوتے ہوئے بھی کھل نہ تھا۔ البتہ اگر وہ زندہ رہ گیا تو بہت جلد اپنی تمام شیطانی قوتیں حاصل کر لے گا اور اس کے بعد اسے فدا کرنا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہوگا۔

خانقاہ کے دروازہ پر برادر مارک تین چار دوسرے راہبوں کے ساتھ فخر کھڑا تھا۔

”برادر مارک۔“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”لڈوگ کو اس کے حجرے میں لے جاؤ۔ اس کے ساتھ سختی نہ کرنا، لیکن ہوشیار رہنا، کیونکہ اب اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“

چارلس بہت زیادہ بے چین تھا۔ اس کے دل میں ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ اسے

دروازہ بند تھا۔ دونوں نے کواٹوں پر اپنے کندھے دے کر زور مارا تو وہ کھل گئے اور چارلس اور فادر شینڈور اپنے زور میں بیک وقت حجرے میں در آئے۔ اور انہوں نے دیکھا کہ ڈرائیولا ڈانکا کو اپنی ہاتھوں میں گھسیٹ کر کھڑی کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ شیشے توڑ کر وہ دوسری طرف نکل گیا۔
چھکڑا۔ فادر شینڈور نے کہا۔

وہ دونوں حجرے سے نکل کر گزرگاہ میں بھاگ پڑے۔ اور کچھ دیر بعد وہ خانقاہ کے صدر دروازے سے باہر اندھیری رات میں تھے۔ چھکڑا اپنی جگہ پر موجود تھا۔ لیکن اس میں دو گھوڑے جوت دیئے گئے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک انسانی سایہ بھی کوجوان کی نشست پر مستعد اور تیار بیٹھا ہوا تھا۔

یہ ایک اندھیرے میں سے ڈرائیولا نکل آیا۔ وہ بے ہوش ڈانکا کو اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ڈانکا کو تپوتوں کے بیچ میں ڈال دیا۔ اور خود اچک کر کوجوان کے قریب بیٹھ گیا۔ چابک کا سزا کارات کی تاریکی میں گونج گیا۔ اور گھوڑے خاموشی سے چھکڑے کو کھینچنے لگے۔ کوجوان ذرا آگے کی طرف جھکا تو اس کے سر پر سے کپڑے کی بڑی ٹوپی جس نے اس کے نصف چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ کھسک گئی یہ کوجوان کوئی اور نہیں بلکہ کلیو تھا۔

دفعاً ”کہیں سے ایک انسانی سایہ نکل کر چھکڑے کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔“

”آقا! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔“

یہ آواز لڈوگ کی تھی اور یہ وہی تھا۔ جو چھکڑے کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

فادر شینڈور نے پھانک کھلایا اور چھکڑے کی طرف بھاگا۔ چارلس اس کے پیچھے تھا، ڈرائیولا نے ان دونوں کو آتے دیکھا تو وہ غصے سے بھیڑیے کی طرح نہایت زور سے چیخا۔ اور لڈوگ کو بڑی ہمدردی سے ایک طرف ڈھکیل دیا۔ گھوڑے پھر آگے

”ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں؟“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”نہیں بھی۔ جب ہم آپ کو یہاں لائے تھے۔ تو اس وقت آپ وقت اور فاصلے کا اندازہ لگانے کے قابل ہی نہ تھے۔“

”آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟“

”صرف یہ کہ یہاں سے قعر تک پورے ایک دن کی مسافت ہے۔ وہ بھی تیز رفتار گھوڑے پر۔“

”تب تو اور بھی برا ہوا۔“

”نہیں بلکہ اس میں الٹا ہمارا ہی فائدہ ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”کچھ ہی دیر بعد رات ختم ہو جائے گی۔ اور دن کا اجالا پھیلتے ہی ڈرائیولا اپنی تابوت میں جاسوئے گا۔“

”لیکن ہم نے تابوت میں صلیب رکھ دی ہے اور آپ نے کہا تھا کہ اب ڈرائیولا اس میں گھس نہ سکے گا۔“

”ہم نے صلیب رکھ دی تھی تو کلیو اسے نکال کر پھینک دے گا۔ اپنے آقا کا بستر تیار کرے گا۔ اور جب اس کا آقا تابوت میں لیٹ جائے گا تو پھر کلیو آپ کی بیوی کی نگرانی کرے گا۔ چنانچہ آپ کی بیوی دن پھر محفوظ رہیں گی یہ لیجئے۔“

اور فادر شینڈور نے بندوق میں کارتوس بھر کر چارلس کے ہاتھ میں تھما دی اور خود اپنی میز کی درازیں کھول کر ان میں کسی چیز کو تلاش کرنے لگا۔

”مناسب ہو گا کہ اسے آپ ہی رکھیں۔“ چارلس نے کہا۔ ”یہ آپ کی بندوق ہے اور اس کا آپ استعمال جانتے ہیں۔“

”ہاں لیکن میں نے صرف جانوروں کا شکار کیا ہے، میں انسانوں کو گولی مارنے کا

نہ لٹوگ کی فکر تھی اور نہ برادر مارک کی پرواہ۔ وہ تو جلد از جلد گھوڑے پر سوار ہو کر ڈرائیولا کے تعاقب میں جانا چاہتا تھا۔ ہاں سو اس غفیریت کے تعاقب میں جو ڈائنا کو لے اڑا تھا اور وہ اس خیال سے کانپ گیا۔ کہ اگر وہ ڈرائیولا کو قتل نہ کر سکے یا ڈائنا کو اس کے پنجے سے نہ چھڑا سکے تو اس کی چارلس کی بیوی بھی ہیلن کی طرح ڈائن بن جائے گی۔ چنانچہ ایک ایک لمحہ جو گزر رہا تھا، ڈائنا کو زندہ مردوں کے جہنم کے قریب لے جا رہا تھا۔

لیکن فادر شینڈور پر سکون تھا، چنانچہ اس نے چارلس کو اپنے ساتھ اپنی مطالعہ گاہ میں چلنے کو کہا، موخر الذکر انکار نہ کر سکا، چنانچہ فادر شینڈور کے پیچھے چل دیا۔ وہاں پہنچ کر فادر شینڈور نے کتابوں کی ایک الناری کے پیچھے ہاتھ ڈال کر بندوق باہر نکال لی۔ خانقاہ میں بندوق؟ اپنی بے تابی کے باوجود چارلس اس بات پر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ واقعی عجیب بات تھی۔ کبھی کسی خانقاہ میں بندوق نہ رہی ہوگی۔ راہب تو لازمی جھگڑے اور خون خرابے کے قریب تک نہیں پھٹکتے۔

”ڈرائیولا، آپ کی بیوی کو لے کر سیدھا قعر کی طرف جائے گا۔“ فادر شینڈور نے اس طرح کہا۔ جیسے وہ حالات حاضرہ پر محض وقت گزاری کے لئے تبصرہ کر رہا ہو۔ ”قعر میں پہنچتے ہی وہ محفوظ ہو گا اور پھر آپ کی بیوی کو ہم کسی صورت نہ بچا سکیں گے۔“

”تو پھر ہمیں۔۔۔۔۔“

”ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ ڈرائیولا کو قعر تک نہ پہنچنے دیں بلکہ اسے راستہ ہی میں روک لیں۔“

”تو پھر خدا کے لئے فوراً چلیے فادر۔“ چارلس نے کہا۔ ”آپ یہاں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور ایک دو گھنٹے میں وہ۔۔۔۔۔“

سی ہو گئی ہوگی۔۔۔۔۔ وہ ہوش میں تھی یا بے ہوش یہ تو چارلس نہ جانتا تھا۔ البتہ یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ ڈرائیولا کے قبضے میں تھی اور رات کا اندھیرا اترتے ہی وہ ہمیشہ کے لئے اس کی بن جائیگی ہیلن کی طرح کونٹ ڈرائیولا کی دلمن بن جائے گی۔
وقت تیزی سے گزرتا رہا۔

فادر شینڈور اصرار کر رہا تھا کہ گھوڑوں کو ذرا سستا لینے دیا جائے۔ لیکن چارلس اس قدر بیتاب تھا کہ گھوڑے کو دم نہ لینے دینا چاہتا تھا انہیں مار مار کر اس وقت تک بھگاتا رہے جب تک وہ بے دم ہو کر گر نہیں جاتے۔
دوسرے دن گئی۔۔۔۔۔ دور کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سہ پہر کی روشنی نرم پڑ گئی اور رفتہ رفتہ دن ختم ہونے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ چوراسے پر پہنچ جائیں گے۔۔۔۔۔ ہاں وہ چوراسا دور نہ تھا۔ جہاں سے ایک راستہ قصر ڈرائیولا تک جاتا تھا لیکن اب تک انہیں چھکڑا نظر نہ آیا تھا۔ یقین نہ آتا تھا کہ کلیو نے چھکڑے کی رفتار خطرناک حد تک تیز کر رکھی ہوگی۔ لیکن واقعات ہو چکے تھے وہ ناقابل یقین ہونے کے باوجود حقیقت تھے۔

فادر شینڈور نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں اور دندانے وار اور ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔

”ہمیں چھوٹا اور مختصر راستہ اختیار کرنا چاہئے۔“ فادر شینڈور نے کہا کہ ”ہم ڈرائیولا کے عین سامنے اس چھکڑے کو روک لیں۔ آئیے۔“

اور انہوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں وحشت ناک ڈھلانوں کی طرف موڑ دیں۔ ڈھلان جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ان کے گھوڑوں کی رفتار تیز نہ تھی، ایک طرف گھنے جنگل کے کنارے کنارے اوپر چڑھ رہے تھے۔ جھاڑیاں ختم ہوئیں اور اب ڈھلان سنگلاخ تھی۔ یہاں وہاں چھوٹے بوے پتھر پڑے ہوئے تھے اور ان کے

عادی نہیں ہوں۔“

”لیکن ڈرائیولا انسان تو نہیں ہے؟“

”بے شک۔ اسی لئے اس پر گولی اثر نہیں کر سکتی۔“

”پھر یہ بندوق۔۔۔۔۔“ چارلس کا دماغ مارے پریشانی کے بالکل محسوس ہو گیا تھا۔

”کلیو کے لئے ہے۔ وہ ویپائر نہیں انسان ہے اور شاید آپ کو اس پر گولی چلانے کی ضرورت پڑ جائے۔ مسٹر چارلس! بوقت ضرورت میں اپنی خانقاہ کے اصولوں میں ردو بدل کر سکتا ہوں۔ لیکن وہ بھی ایک حد تک چنانچہ کلیو پر میں گولی چلا نہ سکوں گا۔ ہمیں۔۔۔۔۔ چند نئے نوکدار کھونٹوں کی ضرورت پڑے گی۔ آئیے آپ اور برادر مارک گھوڑوں پر زین کس دیں تب تک میں ڈرائیولا کو فنا کرنے کے انتظامات مکمل کر لوں۔“

رات کے آخری گھنٹے ختم ہو رہے تھے اندھیرا سٹ کر افق مغرب میں ڈوبنے لگا تھا اور افق مشرق سے روشنی کے سوتے پھوٹ رہے تھے چارلس اور فادر شینڈور اپنے اپنے گھوڑے پر سوار اب تک اندھیرے میں اور اندازاً راستے طے کرتے رہے تھے لیکن اب وہ اپنے سامنے کچی سڑک پر چھکڑے کے پیوں کے نشانات دیکھ سکتے تھے۔

کچی سڑک پر پیوں کے ہلکے نشانات اور ان کے کناروں پر مردہ مٹی کی مٹھی برابر ڈھیریں اس بات کا پتہ دیتی تھیں کہ کلیو چھکڑے کو صحیح معنوں میں اڑا لے گیا تھا۔ ڈرائیولا اپنے تابوت میں لیٹ چکا ہوگا۔ لیکن اس کے خادم نے چھکڑے کی رفتار کم نہ کی تھی اور ڈانٹا۔؟

چارلس اپنے گھوڑے کو بے تحاشہ ایڑی مارنے لگا۔ ڈانٹا کی اس وقت کی حالت کے تصور نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ خدا جانے وہ اب تک بے ہوش ہوگی یا ہوش میں آچکی ہوگی اور اگر اسے ہوش آگیا ہوگا۔ تو مارے خوف کے اس کی حالت وحشیوں کی

فوراً ہی وہ دونوں سڑک پر نکل آئے اور آگے بڑھتے ہوئے چھکڑے کے راستے میں کھڑے ہو گئے چارلس نے بددق اٹھائی اور کوچیان کی نشست پر بیٹھے ہوئے کلیو کو اس کی زد میں لے لیا۔

کلیو لمحے بھر کے لئے دم بخود رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے وہاں ان دونوں کی موجودگی کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو، دفعتاً اس کے چہرے کے پٹھے دھیلے پڑ گئے اس کا منہ کھل گیا اور اس نے گھوڑوں کی لگا میں کھینچ لیں۔

بددق کی نالی عین اس کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی

قادور شینڈور نے کہا ”بس۔ بہت دور آگے اتر آؤ چھکڑے پر سے۔“

ایک لمحہ تک کلیو بے حرکت بیٹھا رہا جیسے وہ اس بات پر غور کر رہا ہو کہ قادور شینڈور کے اس حکم کی تعمیل کرنا کہاں تک مناسب ہو گا۔ پھر وہ ایک طرف کھسک کر نشست کے کنارے پر آگیا اور اس کا دایاں ہاتھ لگام چھوڑ کر پیلو کی طرف لٹک گیا۔ یکایک تاریک ہوتی ہوئی فضا میں بجلی سی کوئد گئی، کلیو کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو تھا اور اس نے اپنا چاقو والا ہاتھ بلند کیا۔ وہ چاقو قادور شینڈور کی طرف پھینک کر مارنے کی تیاری کر رہا تھا، لیکن اس کے دل کی دل ہی میں رہی۔ ابھی اس کا ہاتھ جھکا بھی نہ تھا کہ چارلس نے بلبلی دیادی۔

گوئی شاید اس کے سینے میں لگی تھی، کیونکہ گوئی کے دھکے کو برداشت نہ کر کے وہ دہرا ہو کر انچ بھرا چھلا، گرا، نشست پر گھڑی بھرا پھلتا رہا۔ اور پھسل کر ڈھرام سے سڑک پر آ رہا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا تھا۔ کلیو نے پھر حرکت کی۔ قادور شینڈور چھکڑے کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کے قریب پہنچتا، گھوڑے خوف سے ہینا کر پیچھے ہٹے اور پھر ایک دم سے بھاگ پڑے اگر چارلس

گھوڑے ٹھوکر میں کھاتے اوپر چڑھ رہے تھے۔

اندھیرا ان سے زیادہ تیز ثابت ہوا۔ اور وہ ڈھلان کی چوٹی پر سے تیز دھارے کی طرح بہہ آیا تھا، جیسے وہ ان دونوں کو روک دے گا لیکن وہ آگے بڑھتے رہے اور چڑھتے رہے۔

چارلس پوری طرح ناامید ہو چکا تھا، اس کے باوجود وہ گھوڑے کو آگے بڑھا رہا تھا۔ محض اس لئے کہ یہاں سے لوٹ جانا بھی اتنا ہی بے معنی تھا جتنا کہ اب سے یہ تعاقب نظر آ رہا تھا۔ وہ مایوس ہو چکا تھا، کہ یکایک بائیں طرف قصر ڈراکیولا کی سیاہ دیواریں یوں نمودار ہو گئیں۔ جیسے پورا قصر کسی جادو کے زور سے زمین میں سے نکل آیا ہو۔ عین سامنے راستہ تھا۔ اور کچے راستے پر چھکڑے کے پیوں کے تازہ نشانات نظر نہ آ رہے تھے۔

ڈراکیولا کا چھکڑا اب تک تو اس طرف سے نہ گزرا تھا۔

قادور شینڈور اپنے گھوڑے پر سے اتر آیا، اور اسے ایک درخت سے باندھ دیا، چارلس نے اس کی تقلید کی وہ دونوں اپنا دم درست کر رہے تھے کہ چھکڑے کے پیوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سنائی دی چارلس اور قادور شینڈور درختوں کے جھنڈ میں سے نکل کر سڑک کے اس موڑ کی طرف بڑھے جس کے دوسری طرف سے یہ آواز آ رہی تھی۔

آواز سے معلوم ہو رہا تھا۔ کہ چھکڑا، آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ گھوڑے شاید مسلسل سفر کرنے کی وجہ سے تھک گئے تھے موڑ پر چھکڑا نمودار ہو گیا۔ کلیو کوچیان کی نشست پر اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ چھکڑے کا ایک پیہ پتھروں میں اتر گیا۔ تو کلیو کے پیچھے چھکڑے میں رکھے ہوئے دو تابوت اکدم سے اچھل کر آپس میں ٹکرائے۔

قادور شینڈور نے گردن گھما کر چارلس کی طرف دیکھا اور اپنی بھنویں اچکائیں

تابوت پل کے کنارے پر سے بھی پھسل کر خندق میں جا پڑا خندق کا پانی بخ بن چکا تھا۔ چنانچہ تابوت اس پر پھسلتا ہوا قصر کی کائی آلود دیوار تک چلا گیا۔ ایک اور تابوت اب بھی چھکڑے میں رکھا ہوا تھا۔ چارلس اپنے گھوڑے سے اتر کر جھکے ہوئے چھکڑے پر جا چڑھا فادر شینڈور اس کے پیچھے تھا۔ دونوں نے مل کر تابوت کا ڈھکن اٹھایا تو اس وقت ان دونوں کے بوجھ سے چھکڑا اور بھی زیادہ جھک چکا تھا۔



اچھل کر ایک طرف نہ ہٹ گیا ہوتا تو گھوڑے اور چھکڑا اسے کھینچتا ہوا گزر جاتا۔ گھوڑے بڑی برق رفتاری سے آخری ڈھلان چڑھ رہے تھے اور ان کے منہ اور پھڑکتے ہوئے نختوں سے کف جاری تھا۔ جیسے کوئی ان دیکھا ہاتھ ان پر آتشی کوڑے برسا رہا تھا۔ اور وہ بے تحاشہ اپنی دوزخی پناہ گاہ کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ قصر ڈرا کیولا جو صرف تین فرلانگ میل دور تھا۔

چارلس اور فادر شینڈور نے اپنے گھوڑے کھولنے اور ان پر سوار ہوئے اور انہیں چھکڑے کے پیچھے بھگا دیا۔

اچھتا کودتا اور جھومتا ہوا چھکڑا قصر کی خندق کے چوٹی پل کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اور دونوں متعاقب کرنے والوں سے کئی گز آگے تھا چھکڑے کی رفتار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پچھلے پہننے سڑک سے تقریباً ایک انچ اوپر تھے وہ اسے چھونہ رہے تھے۔ بے تحاشہ بھاگتے ہوئے گھوڑے خندق کے پل پر سے گزر رہے تھے کہ چھکڑے کا ایک پچھلا پیسہ آڑھ میں پھنس گیا جس کا دوسرا برا قصر کی دیوار میں مضبوطی سے لگا ہوا تھا۔ چھکڑا کے نختوں کی چرچر اہٹ، اس کے آہنی سازو سامان کی جھنکار اور پہننے کے ٹوٹنے کا چٹاخہ سنائی دیا۔ چھکڑے کے یوں اچانک ختم جانے کہ وجہ سے گھوڑوں کو ایسا شدید جھکا لگا کہ ایک گھوڑا درد اور تکلیف سے چیخ اٹھا۔ اور دوسرا اپنی اگلی ٹانگوں پر بیٹھ گیا۔

پہننے کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے چھکڑا آہستہ آہستہ ایک طرف جھکنے لگا۔ اس میں رکھے ہوئے دو تابوتوں میں سے ایک پھسل کر چھکڑے کے کنارے تک آگیا۔ اور وہاں ٹھہر گیا۔ لیکن چھکڑا اور جھکا اور تابوت چھکڑے کے کنارے پر سے پھسل کر چوٹی پل کے کنارے پر آ پڑا۔

چارلس اور فادر شینڈور نے گھوڑوں کی لگائیں کھینچ لیں اور انہوں نے دیکھا کہ

چارلس چھڑے پر سے لنگ کر پل اور وہاں سے چھوٹی سی عمودی ڈھلان پر سے کچھ بھاگتا اور کچھ بھسلتا ہوا خندق میں آگیا۔ خندق قصر کی دیوار اور کنارے کے درمیان ایک اندھیرے اور زبردست فشار کی طرح تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے چارلس نے برف کا معائنہ کیا اور اپنی ایک ٹانگ پر بدن کا پورا بوجھ ڈال کر اسے آزمایا۔ برف کافی مضبوط معلوم ہوتی تھی اور اگر وہ تابوت کا بوجھ سہار گئی تھی تو یقیناً چارلس کا بوجھ سہار سکتی تھی۔

چارلس تابوت کی طرف چلا۔

سورج کی آخری سرخ کرن قصر ڈرائیولا کے بلند ترین برج کا ماتھا چوم کر رخصت ہوئی۔ خندق میں گہرا اندھیرا ہو گیا۔ تابوت کے ڈھکن کے جوڑ چارلس کو نظر نہ آرہے تھے۔ البتہ اتنا تو بہر حال معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا ڈھکن مضبوطی سے بند تھا اور اس تابوت کے ڈھکن سے جس میں ڈانٹا تھی۔ مختلف ساخت کا تھا چنانچہ اسے کھولنا آسان نہ تھا۔ وہ ڈھکن کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

”وقت گزر گیا۔“ پل پر سے آواز سنائی دی۔

چارلس نے اپنی کوششیں ترک کر کے اور سر اٹھا کر پل کی طرف دیکھا۔ وہاں قادر شینڈور اور اس کا سہارا لئے ڈانٹا کھڑی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔

”چارلس! وقت گزر گیا۔ وہاں سے فوراً ہٹ آؤ۔“ قادر شینڈور نے پھر کہا۔

چارلس شش بچ کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ کیا کرے وہ ذرا سا تابوت کی طرف گھوم گیا اور عین اسی وقت تابوت میں لیٹے ہوئے ڈرائیولا نے ڈھکن اٹھا کر دور پھینکا اور ایک استخوانی ہاتھ نے تابوت میں سے نکل کر چارلس کی کلائی پکڑ لی۔ اسکی سرد اور پتلی انگلیوں کی گرفت آہنی تھی۔

چارلس نے اپنے قدم جمائے کو کوشش کی کہ اس عفریت کا مقابلہ کر سکے جو

تابوت میں ڈانٹا لیٹی ہوئی تھی اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ کھلی کیا تھیں پھٹی ہوئی تھیں، اور چارلس کانپ گیا۔ اس نے سوچا کہ ڈانٹا اسے نہ دیکھ رہی تھی، اسے پہچان نہ رہی تھی۔ شاید وہ ڈائن بن پگی تھی۔ ڈرائیولا اس کا خون چوس چکا تھا۔ اور اسے اپنی دلس بنا چکا تھا۔ لیکن نہیں۔۔۔ چارلس کا یہ خدشہ بے بنیاد تھا کیوں کہ فوراً ہی ڈانٹا کے رخسار پر ایک آنسو لڑھک آیا۔ اور اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

چارلس نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے کے اسے تابوت میں سے باہر نکال لے لیکن قادر شینڈور نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”آپ ان کی طرف سے بے فکر رہیے۔ میں تو نہیں ہوں البتہ آپ۔۔۔ اس کا فیصلہ کر دیجئے۔“

اور چارلس نے نیچے خندق میں نظر کی۔ جی ہوئی ٹھوس برف پر سے دھوپ کی روشنی ختم ہو رہی تھی۔ اور ڈرائیولا کا تابوت اس کے انتہائی سرے پر اور قصر کی دیوار کے قریب پڑا ہوا تھا۔

”آپ کو جلدی کرنی چاہئے“ قادر شینڈور نے کہا ”دن کی روشنی ختم ہو رہی ہے۔“

تاہوت میں سے نکل رہا تھا۔ اس کے پیر جمعنے کے بجائے برف پر سے پھسل رہے تھے۔

”گولی مار دیجئے اے“ ڈانکا چی رہی تھی ”آپ اے گولی کیوں نہیں مارتے؟“
”بے فائدہ ہے بیٹی“ قادر شینڈور کی آواز میں تاسف تھا۔ گولی اس پر اثر نہ کرے گی۔“

چارلس نے ڈانکا کو قادر شینڈور کے ہاتھ سے بندوق کھینچنے دیکھا اس عرصے میں ڈرائیولا فتح مندانہ غراہٹ کے ساتھ تاہوت میں سے نکل آیا تھا۔ چارلس اور ڈرائیولا ہاتھ پائی کرتے قصر کی دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ چارلس نے ڈرائیولا کے جڑے پر ایک زور دار گھونسا رسید کر دیا۔ لیکن ہاتھ اس نے اس زور سے چلایا تھا کہ خود ہی توازن کھو بیٹھا۔ اس نے سنبھلنے کے لئے دونوں ہاتھ چلائے تو ڈرائیولا نے اس کا حلق دیوچ لیا۔ اور اسے قصر کی طرف دھکیلتے لگا۔

عین اسی وقت بندوق کے دھماکے کی آواز قصر کی بے حس دیواروں سے ٹکرائی۔ گولی ڈرائیولا کے تونہ لگی البتہ ان سے صرف چند قدم دور برف سے ٹکرائی۔ برف کی ایک لمبی سنے قاش اگھڑ گئی اور وہاں سے پانی کا چھوٹا سا فوارہ بل پڑا اور چارلس نے ڈرائیولا کو گھبرا کر ایک طرف ہٹے محسوس کیا۔

پانی کچھ دور تک سطح برف پر بننے کے بعد پھر اسی میں سما گیا۔

”ہاں۔“ قادر شینڈور چلایا ”بہت پانی۔۔۔۔۔“

مسلسل دو دھماکے سنائی دیئے۔ ڈرائیولا غرایا اور اس نے چارلس کو قصر کی دیوار تک ڈھکیل دیا۔ عین اسی وقت بندوق کی تیسری گولی ان کے بہت قریب برف میں آکر لگی اور اسی دفعہ برف کی سطح پر ایک ٹیڑھی میڑھی اور خطرناک دراڑ پیدا ہو گئی۔

غصے کی ایک پھنکار کے ساتھ ڈرائیولا نے چارلس کو چھوڑ دیا۔ وہ آزاد تھا اور اب

وہ کچھ دوڑتا اور کچھ پھسلتا ہوا خندق کے کنارے کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ برف اس کے پیروں تلے دب گئی اور سرد پانی اس کے پیروں سے پٹ گیا۔ چارلس لڑکھڑایا۔ منہ کے بل گرا اور سینے اور پیٹ کے بل برف پر اپنے آپ پھسلتا ہوا کنارے تک پہنچ گیا۔

جب وہ ساحل پر چڑھ رہا تھا تو اس نے بندوق کے کئے ایک مسلسل دھماکے سنے۔ قادر شینڈور نے بندوق میں نئے کار توں بھرے اور متواتر لمبی دبانے لگا۔ برف پر گولی کے لگنے اور پھر اس کے فوراً بعد ہی برف کے پھٹنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ سطح برف پر کئی دراڑیں پیدا ہو گئیں اور پھر مسلسل گولیوں کی تاب نہ لا کر وہ سب کی سب آپس میں بھٹگیر ہو گئیں۔ اور بخ بستہ سطح سے پانی کے سوتے پھوٹ نکلے اور پانی برف کی سطح پر بننے لگا۔

ڈرائیولا دیوار میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پٹے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس پر چڑھ کر اپنے آپ کو فنا ہونے سے بچا لے۔

چارلس دوڑ کر ڈانکا کے قریب پہنچ گیا۔ ڈرائیولا سے ہاتھ پائی اور پھر کنارے تک پہنچنے کی کوششوں نے اسے تھکا مارا تھا چنانچہ جب وہ اپنی بیوی کے قریب پہنچا تو بری طرح ہانپ رہا تھا لیکن خندق میں ادھر ادھر کھسکتے اور راہ فرار تلاش کرتے ہوئے ڈرائیولا کی کوششیں بڑی جاذب توجہ تھیں۔ بلکہ پٹانزم کا اثر رکھتی تھیں چنانچہ وہ اس کے طرف دیکھنے لگا۔

قادر شینڈور نے شت باندھ کر ایک بار لمبی پھر دیادی۔

یوں معلوم ہوا جیسے کسی نے برف کا ایک سرا پکڑ کر اس سے ایک بڑا سا ٹکڑا نوچ لیا ہو۔ برف کٹ گئی۔ وہ حصہ جس پر ڈرائیولا کھڑا ہوا تھا۔ الگ ہو گیا۔ اور پھر وہ ایک طرف نیچے کی طرف جھکنے لگا۔

تھے وہ انہیں دیکھ کر سکرانے لگے۔

ختم شد



آئیڈیل
گلی مشرق
پرو پرا

آئیڈیل
گلی مشرق
پرو پرا

ڈرائیولا غصے اور انتقام کی آگ سے بے تاب ہو کر دونوں کے بزدل میں جلا غیث روح کی طرح بھیانک آواز میں چیخا، سامنے کھڑے ہوئے اپنے کامیاب دشمنوں کی طرف دونوں ہاتھ چلائے، گرا اور بغل تک ڈوب گیا۔ ایک لمحے تک وہ برف کا کنارہ پکڑے رہا لیکن اس کی انگلیاں اندر کی طرف مڑ رہی تھیں اور اٹھ رہی تھیں یا شاید وہ مٹی بن رہی تھیں۔ بہر حال یقین سے سمجھ نہیں سکا جاسکتا کیونکہ عین اسی وقت برف کا وہ سرا جسے ڈرائیولا نے پکڑ رکھا تھا۔ ٹوٹ گیا اور برف کی تہہ کے نیچے بہتے ہوئے پانی نے اس عفریت کو آہستہ آہستہ نکل لیا۔

غرق ہوتے وقت اس کا بھیانک لمبو ترا چہرہ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اور اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ عفریتوں کا وہ آقا شاید اپنی مدد کے لئے ان غیث روحوں کو پکار رہا تھا جو وہاں نہ تھیں۔ اور پھر بانی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ سرخ دھاریوں والا سیاہ لبادہ ایک سیکنڈ تک سطح آب پر مردہ چمکاؤ کے بازوؤں کی طرح پھیلا رہا اور پھر وہ بھی غرق ہو گیا۔

چارلس نے ڈانکا کو سینے سے لگا کر اس کے ہونٹ چوم لئے لیکن فادر شینڈور بدوق کا گھوڑا چڑھائے اب بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا جہاں ڈرائیولا غرق ہوا تھا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ قاتل ہو چکا ہے۔ اسے خوف تھا کہ کہیں وہ پھر زندہ ہو کر نہ نکل آئے۔

لیکن پانی کی سطح پر برف کے ٹکڑوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

اندھیرا گاڑھا ہو رہا تھا۔ قصر ڈرائیولا خاموش اور مبہوت کھڑا تھا اور اس قصر کا مالک، کوئٹ ڈرائیولا قاتل ہو چکا تھا۔

اب وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔

فادر شینڈور نے چارلس کی طرف دیکھا جسکے ہونٹ ڈانکا کے لبوں سے چپاں

پکاروں مارا انتخاب



کچھ حسن کلامی